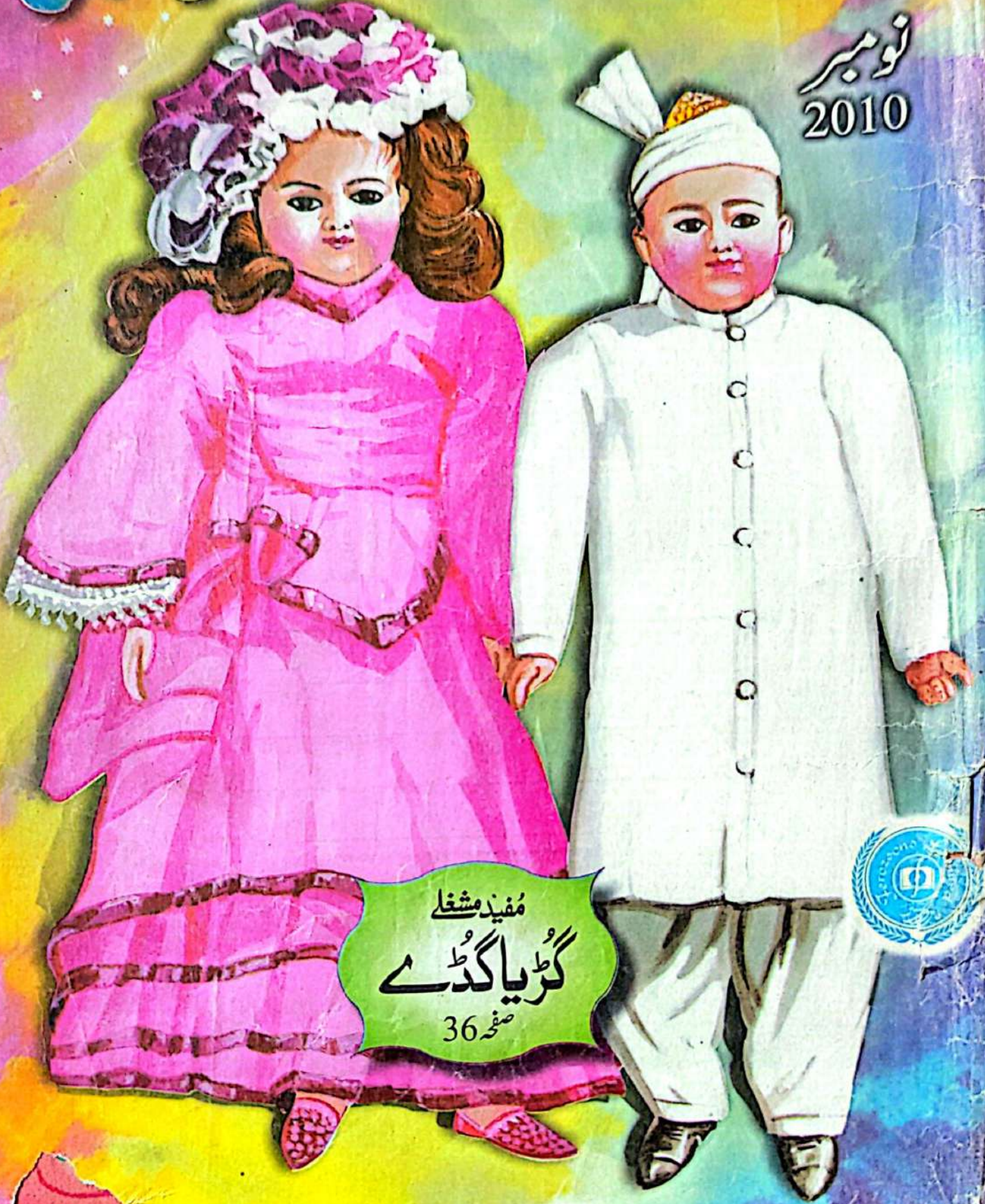


عید مبارک

تعلیم و تربیت

نومبر
2010



مفید مشغلہ
گڑیا گڈے
صفحہ 36





COMMANDER SAFEGUARD'S
MISSION: CLEAN SWEEP

BACK TO SCHOOL

جلد آرہا ہے آپ کے پسندیدہ ٹی وی چینل پر!

سینف گارڈ صحت و صفائی ٹیم کو اپنے اسکول بلانے کے لئے ابھی۔۔۔

5050  www.safeguard.com.pk  0800-99900  Commander@safeguard.com.pk 

بلیکے دیا گیا نام ہر کر **PO Box 8046** پر بھیجیں

✂

_____ آپ کا نام:

_____ آپ کا فون نمبر:

_____ اسکول کا نام:

_____ اسکول کا پتہ:

_____ اسکول کا فون نمبر:

✂



IAL Saatchi & Saatchi

70 واں سال ساتواں شمارہ

(رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی)

بچوں کا
محبوب رسالہ

تعلیم و تربیت

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا

نومبر 2010ء

اس شمارے میں

- 1 ادارے
- 2 درس قرآن وحدیث سید مقبول حسین شاہ
- 3 نعت خالد بڑی
- 4 سب سے پیاری چیز پروفیسر محمد عارف خان
- 7 شاعر مشرق ضیاء الحسن ضیاء
- 8 دادا جان کی باتیں اعتبار ساجد
- 12 پس پردہ جدون اویب
- 15 میرے پسندیدہ اشعار بلال دق جاسم
- 16 اقبال ایک عظیم شاعر محمد فاروق دانش
- 19 تحفہ علی اکمل تصور
- 23 عید الاضحیٰ رفیق احمد چودھری
- 25 ایک سبق تمہارے لئے محمد یاسین یوسف
- 28 بچوں کا انسائیکلو پیڈیا طارق ریاض خان
- 30 فرض شہرلوہی حدی انجم
- 32 حکوی گڑیا ناصر ملک
- 33 علامہ اقبال کی گفتگو۔۔۔ رانا محمد شاہد
- 36 مفید مشغلہ غلام حسین مین
- 40 خاتم شکاری اور دینا عارف شین روہیلا
- 45 آدم خور شیرینی احتشام الدین
- 50 دادوی علی آزاد دانش ذہین قاریمن
- 51 آپ بھی لکھئے ہونہار لوب
- 55 آپ کا خط ملا ختمے قاریمن
- 57 پیاری چڑیا فرزاد جیسہ
- 58 دیر مت کروا نذیر انبالوی
- 62 میری زندگی کے۔۔۔ پُر عزم قاریمن
- 63 ہونہار مصور ختمے مصور
- 64 بلا عنوان ختمے خوش ہمیں

اور بہت سے دل چپ تراشے اور سلسلے سرورق: ”گنیا گڈے“

قیمت فی پرچہ
25 روپے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

امید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔

9 نومبر شاعر مشرق، حکیم الامت اور مصور پاکستان ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کا یوم پیدائش ہے۔ آپ کو ”مصور پاکستان“ اس لیے کہا جاتا ہے کہ آپ نے 1930ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الہ آباد میں دو قوی نظریے کی روشنی میں برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک آزاد اور خود مختار مملکت کا تصور پیش کیا تھا۔ آپ مسلمانوں میں عمل، محبت اور اتحاد کا جذبہ پیدا کرنے کے خواہش مند تھے، ان کی شاعری اس خواہش کا بھرپور اور توانا اظہار ہے۔

ایک ننھے ادیب کی کہانی ہمارے سامنے ہے، کہانی اچھی ہے، مگر اچھی ہونے کے باوجود یہ کہانی ہم شائع نہیں کر سکتے، آپ سوچ رہے ہوں گے کہ ایسا کیوں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ لکھنے والے نے کہانی پر نہ تو اپنا نام لکھا ہے اور نہ پتا۔ اب آپ ہی بتائیے کہ ایسی کہانی کو ہم کیسے شائع کر سکتے ہیں۔ یہ تو ایک مثال ہے، ہمیں ڈاک سے ایسی بہت سی تحریریں ملتی ہیں جن پر بھیجے والے نے اپنا نام لکھنا گوارا کرتے ہیں اور نہ پتا لکھنے کا تکلف۔ ایسے دوستوں کی تحریریں جب شائع نہیں ہوتیں تو وہ ناراض ہوتے ہیں۔ فیصلہ آپ نے کرنا ہے کہ ناراض کسے ہونا چاہیے، ہمیں یا ایسی تحریریں بھیجے والوں کو۔ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کی تحریریں ضائع نہ ہوں تو تحریروں پر اپنا نام اور مکمل پتا ضرور لکھیں۔

ان شاء اللہ نومبر کے تیسرے ہفتے میں مسلمان سنت ابراہیم پر عمل کرتے ہوئے عید الاضحیٰ منائیں گے اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے جانوروں کی قربانی کا فریضہ ادا کریں گے۔ تمام قارئین کو ہماری طرف سے عید الاضحیٰ مبارک ہو۔

اب آپ اس ماہ کا رسالہ پڑھیے اور اپنی آراء و تجاویز سے آگاہ کیجئے۔

خوش رہیں، شاد رہیں اور آباد رہیں

فی امان اللہ (ایڈیٹر)

چیف ایڈیٹر	ایڈیٹر، پبلشر	اسسٹنٹ ایڈیٹر	مشیر خاص	مشیر	سرکولیشن اسسٹنٹ
عبد السلام	ظہیر اسلام	نذیر انبالوی	سید مقبول حسین شاہ	سعید نعت	محمد بشیر رانی

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت پیشی تک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن سیکر: ماہنامہ ”تعلیم و تربیت“ 32- امپریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔
سرکولیشن اور الاؤنس: 60 شاہراہ قائد اعظم، لاہور۔
فون: 36278816-36361309-36361310 فکس: 36278816

ماہنامہ تعلیم و تربیت 32- امپریس روڈ، لاہور
UAN: 042-111 62 62 62 Fax: 042-6278816
Email: tot.tarbiat@gmail.com
tot.tarbiat@live.com

ایشیا، افریقا، یورپ (ہوائی ڈاک سے) = 1250 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، مشرق وسطیٰ (ہوائی ڈاک سے) = 1500 روپے

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک) = 500 روپے
مشرق وسطیٰ (ہوائی ڈاک سے) = 1250 روپے

بچوں کے لیے درس قرآن و حدیث

زندگی کا مقصد

سید مقبول حسین شاہ

بسر کرتا ہے تو وہ فرشتوں سے افضل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ہماری زندگی کا مقصد اللہ تعالیٰ سے محبت اور اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری ہے۔

سورۃ ذاریات کی آیت ۵۶: میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ”میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ میری بندگی (یعنی عبادت اور احکام کی پیروی) کریں۔“ قرآن مجید میں ہمیں یہ بھی نصیحت کی گئی ہے کہ ہم رسول کریمؐ سے محبت رکھیں اور اُن کے ارشادات پر عمل کریں۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ اور رسول کریمؐ کے نافرمان ہیں اُن کے بارے میں **سورۃ النساء کی آیت ۱۴** میں ہے ”اور جو اللہ اور اُس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے گا اور اُس کی حدوں سے نکل جائے گا اُس کو اللہ دوزخ میں ڈالے گا اور اُس کو ذلت کا عذاب ہو گا۔“

صحیح حدیث میں ہے، رسول کریمؐ نے فرمایا: ”جنت میں لے جانے والے اعمال یہ ہیں کہ اللہ کی عبادت بڑے خلوص سے کرو (یعنی اعمال میں اس خلوص کی جھلک ہو)، نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور رشتہ داروں سے میل جول رکھو۔“ (صحیح بخاری، صحیح مسلم) ایک اور صحیح حدیث میں رسول کریمؐ کا فرمان ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک بنانا، والدین کی نافرمانی کرنا اور یاد رکھو جھوٹ بولنا سب سے بڑے گناہوں میں سے ہیں۔“ (صحیح بخاری، صحیح مسلم) پیارے بچو! آئیے عہد کریں کہ ہم اپنی زندگی کے مقصد کو ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھیں گے، اللہ تعالیٰ کے احکام اور رسول کریمؐ کے ارشادات کو جاننے اور اُن پر عمل کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو اتنا اعلیٰ مقام عطا کیا ہے اُس کا ہم خیال رکھیں گے اور ہر وہ کام کریں گے جس سے اللہ تعالیٰ ہم سے خوش ہو۔ آمین۔

☆☆☆

اللہ ہر چیز کا خالق یعنی پیدا کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز بغیر مقصد کے پیدا نہیں کی۔ انسان کی تخلیق سے پہلے ملائکہ یعنی فرشتے موجود تھے جو مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار تھے۔ فرشتے اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کرتے۔ پھر انسان کو پیدا کرنے کا مقصد کیا تھا۔ قرآن مجید میں ہے:

سورۃ ص آیات ۷۱-۷۲: ”تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں مٹی سے ایک انسان بنانا ہوں۔ جب اُس کو ٹھیک بنا چکوں اور اُس میں اپنی روح پھونک دوں تو اُس کے آگے سجدے میں گر جاتا۔“

انسان کا اس سے بڑا مقام اور کیا ہو سکتا ہے کہ فرشتے اُسے سجدہ کریں۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہے کہ ہم اپنے اعلیٰ ترین مقام کو ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھیں اور نہایت اچھے کام کریں، اللہ تعالیٰ کی محبت کا جواب محبت سے دیں، اللہ کو یاد کرتے ہوئے ہماری آنکھوں سے آنسو نکل آئیں کہ اُس پاک ہستی کو ہم سے اس قدر محبت ہے کہ اُس نے ہمیں فرشتوں سے بھی افضل مقام عطا کیا ہے۔ خواجہ میر درد نے کہا ہے:

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو

ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کرۂ بیاں

یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت یا فرمانبرداری کے لئے معزز فرشتے کچھ کم نہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دردِ دل کے لئے پیدا فرمایا یعنی اللہ تعالیٰ اور اللہ کے بندوں سے محبت کے لئے۔

یہ چیز قابلِ غور ہے کہ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اجازت نہیں جب کہ انسان کو مکمل آزادی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا فرماں بردار بندہ بن کر رہے یا اللہ کی نافرمانی کرے۔ اس آزادی کے باوجود جب انسان اللہ تعالیٰ کا فرمانبرداری بندہ بن کر زندگی

نعت

خُدا کے نبیؐ ہیں ، ہمارے محمدؐ
ہمیں دو جہاں سے ہیں پیارے محمدؐ

غریبوں کے والی ، غلاموں کے مولیٰ
ہمارے دلوں کے سہارے محمدؐ

ہمیں اُن سے رحمت کی خوشیاں ملی ہیں
ہماری ہیں آنکھوں کے تارے محمدؐ

اُنہی کے لئے تو یہ دُنیا بنی ہے
دو عالم سے افضل ، دُلا رہے محمدؐ

ہمارا خُدا کس طرح مہرباں ہے
وہ جس نے کہ ہم پر اُتارے محمدؐ

اگر ڈگمگائے گی اُمت کی کشتی
لگا دیں گے اُس کو کنارے محمدؐ

ہمیں دو جہاں سے ہیں پیارے محمدؐ
ہمارے محمدؐ ، ہمارے محمدؐ

خالد بزمی



سب سے پیاری چیز

پروفیسر محمد ظریف خان (کراچی)

تھے۔

اور یہ سال دیکھ کر داور سر پر پیر رکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ مگر آج اُن کے دُور و نزدیک کوئی موجود نہ تھا۔ وہ بڑے مزے سے اپنا کام کر رہی تھیں کہ اچانک انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے اُن کی کمر پر کسی خود کش بمبار نے حملہ کر دیا ہو۔ وہ لکر ہی اتنی زور دار تھی کہ وہ پہلے تخت پر سجدہ ریز ہوئیں اور پھر لڑھک کر نیچے جا پڑیں۔ سبزی کا تخت بھی پھسل کر گرا اور الٹ گیا۔ ہری ہری گھاس پر اُن کی بڑی ترتیت کے ساتھ تراشی ہوئی پالک بڑی بے ترتیبی کے ساتھ پھیل گئی۔ پھر چھری کہیں تو تخت کہیں، خالہ ادھر تو سبزی ادھر اور پھر جیسے ہی خالہ کی نظر خود کش بمبار پر پڑی تو اُن کے منہ سے ہائے، کے ساتھ یہ کونے نکلنے لگے:

”ارے تیرا ستیاناس ہو..... مینڈھو خان..... تیرا بیڑا غرق ہو..... تجھے ڈھائی گھڑی کی آئے..... ہائے ہائے..... اف..... اووف..... آنے دے بکرا عید..... ناس پیٹے کو میں اپنے ہاتھوں سے حلال کروں گی..... خود چھری چلاؤں اس کی موٹی گردن

برسات کے دنوں میں ایک شام کو ناز خالہ وسیع و عریض کوٹھی کے سبزہ زار میں لکڑی کے آرام دہ تخت پر بیٹھی ڈھیر سارا پالک تراش رہی تھیں۔ موسم بڑا سہانا تھا۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور ساتھ ہی ہلکی ہلکی پھوار قلب کو سرور بخش رہی تھی۔ ناز خالہ بڑے فن کارانہ انداز میں سبزی تراشا کرتی تھیں۔ ایک بار جب سعدیہ خانم نے اُن کی بنائی ہوئی ترکاری اور تراشے ہوئے شلجم، آلو اور مولیٰ گاجر کے ٹکڑے دیکھ کر یہ کہا۔

”سبزی بنانے میں تو ناز خالہ کا جواب نہیں۔“ تو اُسی

وقت شوخ و شریر داور زیر لب بول اٹھا:

”اور باتیں بنانے بھی۔“

ناز خالہ ستر برس کی بوڑھی ضرور تھیں۔ مگر اُن کے منہ میں دانت بھی تھے اور پیٹ میں آنت بھی، ماشاء اللہ اُن کی دیکھنے، بولنے، سننے اور سمجھنے کی ساری قوتیں سلامت تھیں۔ انہوں نے داور کی سرگوشی سن لی۔ وہ یک دم چونک اٹھیں اور پھر پیر سے جوتی اتارتے ہوئی بولیں:

”کیا کہا نیک بخت..... ارے ٹھہر تو سہی..... دیکھتی ہوں

یہ کہہ کر وہ برق رفتاری کے ساتھ انھیں اور تخت کے قریب پڑا ہوا بیچلہ، جو مالی کام کرتے کرتے اُدھر چھوڑ کر چلا گیا تھا اٹھا کر مینڈھو خان پر جھپٹ پڑیں۔ مینڈھو خان خود بھی خالہ پر اپنے سر اور سینگوں کا دوسرا گولہ پھینکنے کے لیے تیار ہو چکے تھے، مگر اسی وقت طرفین میں بچاؤ کرانے کے لیے سعیدہ خانم اور داور خان موقع واردات پر پہنچ گئے تھے۔ داور نے مینڈھو خان کے گلے میں پڑی ہوئی رسی کھینچی تو وہ کسی شریف بچے کی مانند سر جھکا کر پیچھے کی طرف ہو لیا۔ ادھر سعیدہ خانم نے خالہ کے ہاتھ سے بیچلہ چھین لیا اور خالہ کو گلے لگا کر اُن کا شانہ تھکینے لگیں۔ اگر آج اس موقع پر داور اور سعیدہ خانم نہ آجینتے تو پھر یا تو مینڈھو خان، ناز خالہ کو زخمی کر دیتے، یا پھر ناز خالہ ہی بقر عید سے پہلے مینڈھو خان کو قربان کر ڈالتیں۔ خالہ تو اس واردات کے بعد تخت پر پڑی رہیں جب کہ داور مینڈھو خان کو کھینچ کر اُس کے کھوٹے تک لے جا رہا تھا جو نہ معلوم کس طرح اپنی رسی ترا کر خالہ کی جان کو آگیا تھا، مگر اب داور کا ہنسی سے بُرا حال تھا۔ اُدھر سعیدہ خانم بھی اُس وقت اپنے قہقہوں کا گلا گھونٹ کر ناز خالہ کو اپنے کمرے میں لے جا رہی تھیں۔

مینڈھو خان اور ناز خالہ کے مابین یہ کشیدگی کئی ماہ سے جاری تھی۔ مگر ٹھہریے..... پہلے اس بات کا تو علم ہو کہ آخر مینڈھو خان اور ناز خالہ دونوں تھے کون؟ لو بھیجی..... ”مینڈھو خان“ تھے ایک دولت مند شریف انسان سردار دلاور خان کے بارہ سالہ اکلوتے صاحب زادے سردار زادہ اور خان کے چہیتے اور پالتو مینڈھے، جنہیں داور خان نے ایک برس پہلے اس وقت خریدا تھا جب اُن کی عمر صرف دو ماہ کی تھی۔ سردار زادہ کے خیال میں چوں کہ وہ اب بڑے ہو گئے ہیں اس لئے آئندہ بقر عید پر وہ خود بھی اپنی جانب سے قربانی کا فریضہ سر انجام دیں گے۔ وہ اسی مقصد کے تحت اس مینڈھے کی پرورش کر رہے تھے جو خان برادری میں شامل ہو کر ”مینڈھو خان“ کا خطاب حاصل کر چکا تھا اور چند ماہ کے اندر اندر ہی بقول ناز خالہ مینڈھے کے بجائے ہاتھی بن گیا تھا۔ رہیں ناز

خالہ..... تو وہ اس خان دان کی قدیمی خدمت گار تھیں۔ ناز خالہ قیام پاکستان کے وقت اپنی زخمی اور نیم جاں ماں کے ہم راہ ہجرت کر کے کراچی پہنچنے میں کام یاب ہوئیں تو اُن کی عمر اُس وقت صرف سات برس کی تھی۔ ان کا اصل نام نازک جہاں بیگم تھا جو مختصر ہو کر ”ناز“ رہ گیا تھا۔ ناز خالہ کو اُن کی والدہ کے ساتھ سردار دلاور خان کے والد سردار سرور خان کراچی چھاؤنی ریلوے اسٹیشن سے اپنی وسیع و عریض کوٹھی میں لائے تھے۔ ناز خالہ کی والدہ تو چند برس کے بعد انتقال کر گئیں مگر سردار سرور خان نے ناز خالہ کو یتیمی کا احساس تک نہ ہونے دیا۔ انہوں نے ناز خالہ کو اپنی اولاد کی طرح پالا اور ایک شریف انسان سے اُن کی شادی بھی کر دی۔ مگر اب اسے بد قسمتی ہی کہنا چاہیے کہ ناز خالہ کے شوہر بھی چند ماہ کے بعد انہیں ہمیشہ کے لیے روتا ہوا چھوڑ کر وہاں چلے گئے جہاں ایک دن ہم سب کو جانا ہے۔ اور پھر ناز کو سردار سرور خان کے در پر ہی آنا پڑنا۔ سردار صاحب کی خواہش تھی کہ ناز چوں کہ ابھی جواں اور بے اولاد ہے اس لئے اس کی دوسری شادی کر دی جائے، مگر انہوں نے صاف انکار کر کے خود کو اسی گھرانے کی خدمت کے لیے وقف کر دیا، سردار دلاور خان اور اُن کے بڑے بھائی سردار انور خان کی پرورش کا فریضہ ناز خالہ ہی نے انجام دیا تھا۔ سردار انور خان اب بیرون ملک رہتے تھے اور کسی یورپی ریاست کے قانونی باشندے تھے۔

سردار دلاور اور انور خان تو ناز خالہ کو پھوپھی جان کہا کرتے، مگر جب سے سعیدہ خانم دلہن بن کر اس گھر میں آئیں تو یہ رشتہ بدل گیا۔ سعیدہ خانم نے انہیں ناز خالہ کہنا شروع کیا۔ سردار زادہ بھی انہیں ”دادی نازی“ کے بجائے نازی نانی ہی کہتے۔ اب رہے مینڈھو خان..... تو جناب..... ان موصوف کو بھی ناز خالہ نے بوتل سے دودھ پلا پلا کر پالا تھا۔ داور خان بھی ان کی خدمت کیا کرتے۔ وہ اسے سیب، انگور، مالٹے، اور پستے بادام بھی کھلایا کرتے جس کی وجہ سے تین چار مہینے کی عمر ہی میں ”مینڈھو خان“ سال بھر کا نظر آتا تھا۔

اب یہ بات بھی جان لیجئے کہ آخر ناز خالہ اور مینڈھو خان

کے مابین دشمنی شروع کس طرح ہوئی..... قصہ کچھ یوں ہے کہ ایک بار ناز خالہ اپنی فن کارانہ تراشی ہوئی ترکاری کا تخت تخت پر چھوڑ کر کسی کام سے گھر کے اندر گئیں تو اس دوران مینڈھو خان شاہانہ چال چلتے ہوئے نہ معلوم کہاں سے برآمد ہوئے۔ ترشی تازہ تازہ سبزی دیکھ کر اُن کے منہ میں پانی بھر آیا اور انہوں نے آؤ دیکھنا نہ تاؤ..... ٹوٹ پڑے ترکاری پر۔ ناز خالہ کے موقع پر پہنچنے تک موصوف ترکاری کا تین چوتھائی حصہ ہڑپ کر چکے تھے۔ خوش حال گھرانے میں سبزی ترکاری کی تو کوئی کمی نہ تھی مگر ناز خالہ نے اپنی محنت کو اس ظالمانہ طریقے سے برہار ہوتے دیکھا تو اُن کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور انہوں نے ایک جھٹکے سے برگد کے درخت کی شاخ توڑی اور مینڈھو خان کی کمر پر دے ماری۔ ”نازوں“ میں پلے ہوئے مینڈھو خان یہ چوٹ برداشت نہ کر سکے اور ایک زور دار نکر ناز خالہ کے پیٹ پر دے ماری۔ اور وہ ہائے میری توبہ..... ارے بچاؤ بچاؤ..... مار ڈالا ظالم نے کہتی ہوئیں لوٹ پوٹ ہو گئیں۔ اگر مالی بابا اس وقت نہ آتے تو مینڈھو خان نے تو خالہ کی ہڈی پیلی ایک کر دینی تھی۔ پھر بعد میں جو کچھ ہوا وہ تو لمبی داستان ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ اس دن سے ”دونوں“ کے دلوں میں ایسی کدورت پیدا ہوئی جو مینڈھو خان کی قربانی پر ہی ختم ہوئی۔

اگر ناز خالہ کا کوئی سب سے بڑا دشمن تھا تو وہ مینڈھو خان تھے۔ جب کہ داور خان کے لئے وہ سب سے پیاری چیز تھے اور پھر رمضان آیا، عید گزری، ذی القعد کا مہینہ بھی بیت گیا اور پھر آسمیا ذوالحجہ کا مہینہ۔ حج اور قربانی کا مہینہ، ذوالحجہ کی پہلی تاریخ ہی سے یہ سوچ سوچ کر داور خان کا دل بیٹھنے لگا کہ چند روز بعد ان کی سب سے پیاری چیز ان سے جدا ہو جائے گی۔ ادھر ناز خالہ کا دل خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا۔ اُن کا سب سے بڑا دشمن مینڈھو خان ہمیشہ کے لیے آسمانوں پر جانے والا تھا۔ عید الاضحیٰ پر سب گھر والے خوش خوش پھر رہے تھے جب کہ داور خان کا چہرہ بالکل اُترا ہوا تھا۔ جب وہ عید کی نماز ادا کر کے گھر واپس آئے تو یہ دیکھ کر اُن کا دل دھک سے رہ

گیا کہ قصائی گھر پر آپکا تھا۔ دلاور خان اور مالی بابا گھر کے دوسرے ملازم شاہ زیب کی مدد سے اپنے دونوں کمروں کے ساتھ مینڈھو خان کو بھی کھینچ کر کوٹھی کے سبزہ زار میں لے آئے، جہاں ان تینوں جانوروں کی قربانی ہونے والی تھی۔ پھر کیا تھا.....؟ یہ منظر دیکھ کر داور خان پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ دلاور خان نے انہیں پیار کرتے ہوئے ان کے رونے کا سبب دریافت کیا تو پھر وہ ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان صرف یہ کہہ سکے:

”باباجانی..... مینڈھو خان..... میرا پیارا مینڈھو..... میری سب سے پیاری چیز۔“ اور پھر وہ دہائیں مار مار کر رونے لگے۔ دلاور خان نے بڑی شفقت کے ساتھ اُن سے دریافت کیا۔ ”داور خان! کیا تمہیں اس بات کا علم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کیا چیز قربان کرنے کو کہا تھا؟“ ”باباجانی! اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا اپنی بہترین چیز، سب سے پیاری چیز میری راہ میں قربان کر دو۔“ انہوں نے بڑی مشکل کے ساتھ اپنے آنسو روک کر کہا۔ ”تو بیٹا! جب تم یہ بات جانتے ہو تو پھر اپنی سب سے پیاری چیز..... اپنے مینڈھو کی قربانی پر اتنے غم زدہ کیوں ہو؟“ دلاور خان بولے۔

یہ بات سنتے ہی داور خان کو ایسا محسوس ہوا جیسے اُن کے دل پر برف کی ٹھنڈی ٹھنڈی سل رکھ دی گئی ہو..... صبر کی سل..... اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے مینڈھو خان کے گلے پر چھری پھیر دی گئی..... وہ اللہ کی راہ میں قربان ہو گئے۔ اس وقت داور خان بالکل نہ روئے۔ صبر و ضبط کے ساتھ مینڈھو کو ذبح ہوتے ہوئے دیکھتے رہے۔

مگر اب ایک اور عجیب بات ہوئی۔ ناز خالہ جو بڑی مسرت کے ساتھ مینڈھو خان کو حلال ہوتے ہوئے دیکھ رہی تھیں اچانک زار و قطار رونے لگیں اور سب لوگ بڑی حیرت کے ساتھ انہیں آنسو بہاتے ہوئے دیکھنے لگے۔ مینڈھو خان لاکھ اُن کے دشمن سہمی، گھر کے ایک ”فرد“ تو تھے ناں؟ مینڈھو خان کی جدائی کا صدمہ ناز خالہ نے بھی محسوس کیا تھا۔

شاعر مشرق

ضیاء الحسن ضیاء (کراچی)

شاعر مشرق زندہ باد
تیری یاد سے ہیں دل شاد

افکار اعلیٰ تیرے سب
جیسے روشن ہو مینار
تیرے کلام سے دل بیدار

شاعر مشرق زندہ باد
تیری یاد سے ہیں دل شاد

پیارے نبیؐ کا عاشق تھا
قول و عمل کا تھا سچا
تُو نے خودی کا درس دیا

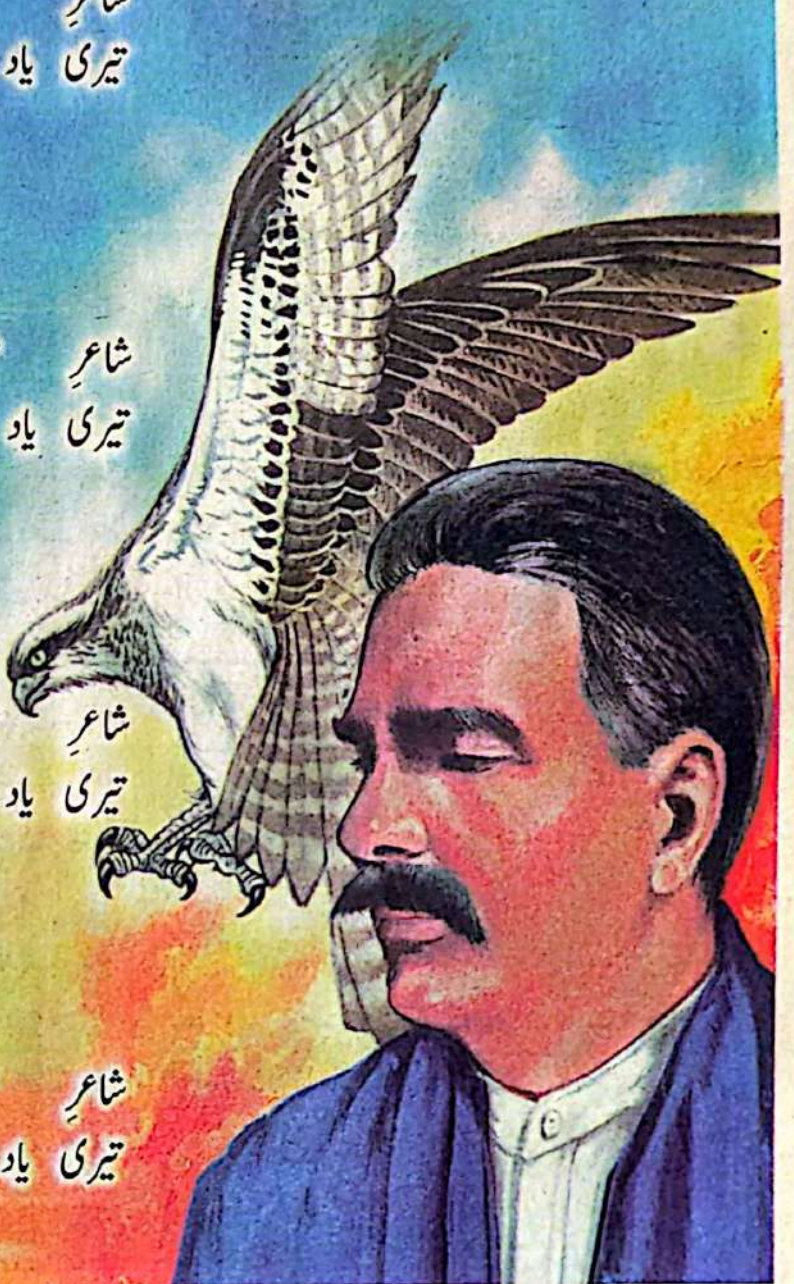
شاعر مشرق زندہ باد
تیری یاد سے ہیں دل شاد

تجھ کو دین سے اُلفت تھی
تجھ کو پیاری ملت تھی
عالی تیری ہمت تھی

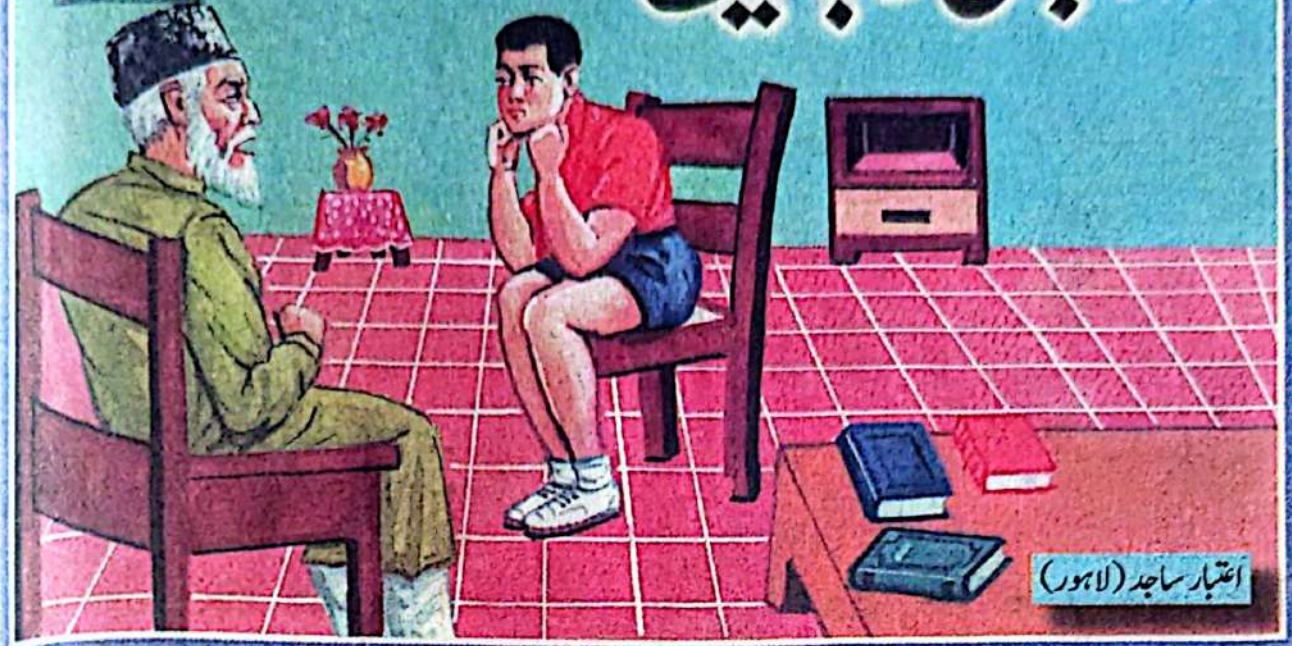
شاعر مشرق زندہ باد
تیری یاد سے ہیں دل شاد

تُو ہی حکیم الامت تھا
قوی شاعر کہلایا
ہر سو تیرا ہے چرچا

شاعر مشرق زندہ باد
تیری یاد سے ہیں دل شاد



دادا جان کی باتیں



آصف نے رک رک کر کہا:

”دادا جی! رات میں نے ٹی وی پر ایک انڈین فلم دیکھی تھی۔ اُس میں ایک ایکڑ بار بار کہہ رہا تھا۔ ہماری زبان ایک، ثقافت ایک، رہن سہن کا طریقہ ایک۔ پھر کیا ضرورت تھی پاکستان بنانے کی۔ بھارت میں صدیوں سے مسلمان آباد پلے آرہے ہیں۔ اب بھی کروڑوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ پھر ایک الگ ملک کیوں بنایا گیا۔ تقسیم کے حوالے سے کتنے انسانوں کا خون بہایا گیا۔ کتنی عورتیں بیوہ ہوئیں۔ کتنے بچے یتیم ہوئے۔ لوگ گھر سے بے گھر ہوئے۔ حاصل کیا ہوا؟ نفرتیں کھپاؤ، کشمکش، عداوتیں۔“

”بس بس.....“ دادا جی نے ہاتھ اٹھا کر کہا:

”میں تمہاری بات سمجھ گیا ہوں بیٹے! اب میری بات غور سے سنو۔“ آصف میاں دادا جی کے اور قریب ہو گئے۔ دونوں ہتھیلیاں ٹھوڑی کے نیچے رکھ لیں اور بولے:

”جی دادا جان! فرمائیے میں آپ کی باتیں غور سے سنوں گا۔“

دادا جی بولے: ”بھئی سیدھی سی بات ہے، ایک گھر میں

آصف میاں کے ذہن میں کئی سوالات کلہا رہے تھے۔ امی کچن میں مصروف تھیں۔ پاپا دفتر جا چکے تھے۔ دادا جان اپنے کمرے میں موٹی عینک لگائے اخبار پڑھ رہے تھے۔ بہن بھائی لان میں کرکٹ کھیل رہے تھے۔ مگر آصف میاں کو کرکٹ سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ وہ تو اپنے ذہن میں آنے والے چند سوالات کا جواب چاہتے تھے، مگر اس گھر میں اس وقت ایسا کوئی فرد نہیں تھا جو دادا جی کی طرح تسلی سے اُن کی باتیں سنتا اور بڑے پیار اور محبت سے اُن کے سوالوں کے جوابات دیتا۔ لہذا آصف میاں بار بار دادا جی کے کمرے کا چکر لگا رہے تھے۔ دادا جی نے عینک ذرا اسی اوپر اٹھا کر انہیں دیکھ لیا۔ بلکہ اُن کی پریشانی کو بھی بھانپ گیا۔ وہ پیار سے بولے:

”آؤ آصف میاں! اندر آجاؤ۔ باہر کیوں منڈلاتے پھر رہے ہو؟“

آصف میاں جھجکتے جھجکتے اندر پہنچے۔ دادا جی کو ادب سے سلام کیا۔ انہوں نے پیار سے اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا:

”ہاں تو کیا پریشانی ہے ہمارے بیٹے کو؟“

بہت سے افراد رہتے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ان میں علیحدگی ہو جاتی ہے۔ حال آں کہ ان کی تو آپس میں قریبی رشتہ داریاں بھی ہوتی ہیں۔ دکھ سکھ بھی سانچے ہوتے ہیں۔ آخر سبب کیا ہوتا ہے کہ وہ الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ ہوتا ہے ناں کچھ نہ کچھ سبب۔

آصف میاں نے سر ہلا کر کہا: ”جی ضرور کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہو گا۔“

دادا جی کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر بولے: ”مسلمان برصغیر پر صدیوں حکمران رہے۔ مسجدیں بھی آباد رہیں۔ مندر بھی آباد رہے۔ رعایا، مسلمان بادشاہوں کی سخاوت، مروت اور شرافت کے گن گاتی رہی، لیکن جب دورِ سمندر پار سے تجارت کے نام پر بحری بیڑے آنے لگے۔ تجارتی کوٹھیاں اور قلعے بننے لگے۔ مال تجارت اور عملے کی حفاظت کے لئے بھی محافظ دستے باہر سے منگائے جانے لگے تو رفتہ رفتہ کاروبار سلطنت میں غیر محسوس طریقے پر ان لوگوں کا عمل دخل بڑھتا گیا۔ پہلے حیدر علی شہید کیے گئے پھر سلطان ٹیپو اور پھر سلطان سراج الدولہ کی باری آئی۔ بدیسی قوتوں نے ہندوؤں سے مل کر باقاعدہ ایک منصوبے کے تحت مسلمانوں کی بیخ کنی شروع کی۔ غدار کسی بھی قوم اور ملک میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ اور ملکی مفادات کو بری طرح نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں بھی یہی ہوا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی بظاہر تو ہندوؤں، مسلمانوں سکھوں اور جاٹوں نے مل کر لڑی، لیکن تختہ الٹا تو بہادر شاہ ظفر کا۔ زیادہ تر سرعام پھانسیاں لگیں تو مسلمانوں کو..... غرض کہ ہر طرح سے مسلمانوں کا استحصال ہوا۔ استحصال سمجھتے ہو نا؟ یعنی پیس دینا۔ تباہ و برباد کر دینا۔ پھر پورے برصغیر اور بنگال پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا راج ہو گیا۔ جسے برٹش راج کہتے ہیں۔ مسلمان قید خانوں میں، عدالتوں میں، کچھریوں میں خوار پھرتے رہے۔ خوشامدیوں اور مکاروں کو سرکاری پناہ مل گئی۔ عہدے مل گئے۔ مخبری کے صلے میں انعامات مل گئے۔ غالب جیسے بے ضرر شاعر کو عدالت میں طلب کر لیا گیا۔ اُن پر ایسے ایسے الزامات لگائے گئے کہ خود غالب بے چارے بھونچکا رہ گئے۔ پھر بہادر شاہ ظفر کو قید کر کے

رنگون بھیج دیا گیا۔ شہزادے اور شہزادیاں در بدر ہوئیں۔ آصف میاں! میں تمہیں خواجہ حسن نظامی کی وہ کتاب دوں گا جو جنگ آزادی کے بعد مغل شہزادوں اور شہزادیوں پر پڑنے والی مصیبتوں اور تکلیفوں کے بارے میں ہے۔ ایک ایک سطر پڑھ کر تمہیں دکھ ہو گا۔“

”ضرور دیکھئے گا دادا جان.....“ آصف میاں نے کہا۔ ”میں وہ کتاب بڑے شوق سے پڑھوں گا۔“

دادا جان کچھ دیر خاموشی سے الاپچی چباتے رہے۔ یہ اُن کی عادت تھی۔ کہا کرتے تھے کہ اس کے چبانے سے منہ کے جراثیم بھی ختم ہو جاتے ہیں اور منہ سے بدبو بھی نہیں آتی۔ اسی لئے جب وہ آصف میاں کو گلے سے لگاتے تھے تو اُن کے منہ سے خوشبو آتی تھی۔

کچھ دیر بعد دادا جی نے کہا: ”خیر آصف میاں، برٹش راج تو ۱۹۴۷ء میں ختم ہو گیا۔ گورے اپنے وطن لوٹ گئے۔ ہمیں آزادی مل گئی، مگر یہ آزادی اس طرح ملی کہ بھارت سے آنے والے مسلمانوں کی ٹرینیں انسانی لہو سے بھیگی ہوئی ہوئیں۔ جہاں سے مہاجرین کی ٹرینیں گزرتیں وہاں موقع پا کر ہندوؤں اور سکھوں کے جتنے ٹرینوں پر حملہ کر دیتے۔ مسلمانوں کو اتنی افراتفری اور انتشار کے عالم میں آنا پڑا کہ وہ اپنا سب کچھ پیچھے چھوڑ آئے۔ لاسکے تو فقط اپنی خستہ حال جانیں لاسکے، مگر جو ہندو یا سکھ یہاں سے گیا وہ فقط اپنا گھر چھوڑ گیا، لیکن اپنی جان و مال عزت آبرو سمیت بھارت گیا۔ خیریت سے گیا اور اس طرح گیا کہ وہاں بھی خوش حال رہا۔ اسے مسلمانوں کی طرح کمپرسی کے عالم میں مہاجر کیپوں میں زندگی بسر نہیں کرنی پڑی۔ آندھی، بارش، دھوپ اور بھوک کی سختیاں نہیں جھیلی پڑیں۔ بہر حال میں اور آسان انداز میں سمجھاتا ہوں کہ تقسیم ہند کی نوبت کیوں آئی۔ قرار داد پاکستان پڑھ کے دیکھ لو۔ ایک ایک بات کی سمجھ آجائے گی۔ سچی بات یہ ہے بیٹے کہ اسلام پاکیزگی کا دین ہے۔ مشرکوں سے بریت کا دین ہے۔ یہ دین ہمیں سکھاتا ہے کہ ہماری ثقافت، رہن سہن، عبادات کے طور طریقے دوسروں سے مختلف ہیں۔ ہم پاکیزگی کو نصف ایمان کا درجہ دیتے ہیں۔ جب کہ

ہے؟ ناراض نہ ہوں تو بتادیں پلیز۔“
دادا جی مسکرا کر بولے: ”لو، بھلا اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔ آصف بیٹے میری عمر 80 برس کے قریب ہے۔“
”آپ نے قائد اعظم کو دیکھا ہے دادا جی؟“ آصف میاں نے پوچھا۔

”کیوں نہیں بیٹے۔“ دادا جی نے بتایا۔ ”دو تین جلسوں میں دیکھا ہے۔ بڑی گرج دار آواز تھی۔ بڑا گھمبیر لہجہ تھا۔ بڑا دبدبہ تھا۔ اُن کی آواز میں، دبلے پتلے لہجے، گورے چہرے۔ انتہائی جاذب نظر تھے۔ آنکھیں اتنی گہری اور چمک دار تھیں کہ کوئی اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا، میں نے تو سر لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن کو بھی دیکھا ہے۔ لیکن سچی بات ہے بیٹے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اپنی وردی اور چمکتے تمغوں اور گوری چمڑی کے باوجود مجھے قائد اعظم کے ساتھ کھڑا ہوا کبھی بارعب نہیں لگا۔ سارا رعب میرے قائد کی شخصیت میں تھا۔ یہ اتنی سچی، کھری اور مخلص شخصیت تھی کہ پورے برصغیر میں اُن کا نعم البدل ناممکن تھا۔ جیسی تو میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ محمد علی جناح ہمارے لیڈر نہ ہوتے تو ہمیں پاکستان نہ ملتا۔ اور معلوم ہے تمہیں کہ وہ برصغیر کے چوٹی کے بیرسٹر تھے۔ اس وقت ان کی فیس اتنی تھی کہ عام آدمی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن جب پاکستان بنا اور وہ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کے عہدے پر فائز ہوئے تو جانتے ہو انہوں نے اپنی تنخواہ کیا مقرر کی؟ صرف ایک روپیہ.....“

”صرف ایک روپیہ۔“ آصف میاں نے چونک کر کہا۔
”ہاں بیٹے صرف ایک روپیہ.....“ دادا جی نے بتایا۔ ”اور یہ تنخواہ بھی وہ اس لئے لیتے تھے کہ رجسٹروں میں درج ہو جائے کہ پاکستان کا گورنر جنرل تنخواہ بھی لیتا ہے۔ مفت کام نہیں کرتا۔ گورنر جنرل ہاؤس کا بجٹ بہت ناپ تول کر بنتا تھا۔ محترمہ فاطمہ جناح بھی اس سلسلے میں بھائی کی معاونت کرتی تھیں۔ فضول خرچی کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ قائد اعظم سادہ غذا کھاتے تھے اور صبح سے رات گئے تک انھنک کام کرتے

دوسروں کے نزدیک گندگی اور پاکیزگی کے درمیان کوئی خط امتیاز نہیں۔ ہمارے رسم و رواج، رہن سہن کے طریقے بھی اُن سے مختلف ہیں۔ ہمارے تہوار مختلف ہیں۔ اُن کے تہوار مختلف ہیں۔ ہم ایک خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ وہ درجنوں بتوں کو پوجتے ہیں۔ گائے ہمارے دین میں حلال ہے۔ جب کہ ان کے نزدیک وہ گنہگار ہے۔ اس کی باقاعدگی پوجا کی جاتی ہے۔ علیحدگی کا ایک سبب یہ بھی تھا۔ دوم یہ کہ تمام اہم اسامیوں پر ہندو فائز تھے۔ مسلمانوں کو اول تو چڑا اسی یا کلرک سے آگے بڑھنے نہیں دیا جاتا تھا اگر خوش قسمتی سے کوئی بہت ہی قابل اور ذہین مسلمان آگے نکل جاتا تو اسے طرح طرح سے تنگ کیا جاتا۔ زچ کر کے رکھ دیا جاتا۔ پھر تجارت کا حال دیکھو..... ساری معیشت، سارا کاروبار ہندوؤں کے قبضے میں تھا۔ مسلمانوں کی اکثریت تو ہندو ساہوکاروں اور سود خوروں کی مقروض رہتی تھی۔ سود در سود سے ان کی زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی تھی۔ آصف میاں دادا جی کی باتیں بڑے غور سے سن رہے تھے۔ بیچ بیچ میں سر بھی ہلا رہے تھے۔ پھر انہوں نے پوچھا: ”دادا جان ایک بات کی سمجھ نہیں آئی۔“

دادا جن نے مسکرا کر پوچھا:

”وہ کون سی بات ہے بیٹے؟“ آصف میاں بولے:

”دیکھئے ناں دادا جان ایکٹر ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔ مسلمان اب بھی کروڑوں کی تعداد میں وہاں بس رہے ہیں۔ آخر وہ کیوں پاکستان نہیں آئے؟“

دادا جی نے کہا: ”آسان سی بات ہے بیٹے۔ جو آگئے وہ آگئے۔ جو رہ گئے وہ رہ گئے۔ آنے والوں کی اپنی خوشی تھی رہنے والوں کی اپنی مجبوریاں تھیں۔ یا تو وہ دُور دراز اور دشوار گزار علاقوں میں تھے جہاں سے بال بچوں اور مال اسباب کے ساتھ ہجرت ممکن نہیں تھی یا بعض ہندوؤں کے اتنے مقروض تھے کہ وہ کسی حالت میں بھی ان کی جان چھوڑنے پر تیار نہیں تھے۔ بعضوں کی جدی پشتی زمین، جائیدادیں، کھیت اور باغات تھے۔ وہ اپنی جاگیروں کے خود مالک تھے۔“

آصف میاں نے اچانک پوچھ لیا: ”دادا جی! آپ کی عمر کتنی

میں ایک بات بتاتا ہوں آصف میاں غور سے سننا۔ اگر ہم ۱۹۷۱ء میں ایٹمی قوت بن کر سامنے آچکے ہوتے تو مشرقی پاکستان ہم سے کبھی جدا نہ ہوتا۔ اس لیے کہ مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنانے والے وہی قوتیں تھیں جنہوں نے پاکستان کے وجود کو کبھی دل سے تسلیم نہیں کیا۔“

اتنا کہہ کر داداجی کی آنکھوں میں آنسو جھلکانے لگے۔ انہوں نے عینک اتار کے رومال سے آنکھیں پونچھیں اور پھر انہوں نے گھٹنی بجا کر آیا جی کو آواز دی کہ چائے اور بسکٹ جلد لاؤ۔ ہمارے آصف میاں غالباً ہماری باتیں سنتے سنتے تھک گئے ہیں۔

آصف میاں جلدی سے بولے: ”نہیں تو داداجی۔ آپ کی باتیں سن کر ساری تاریخ اور ساری حقیقت میرے سامنے آگئی ہے۔ میں آج کی ڈائری میں یہ تمام باتیں لکھوں گا اور دوستوں کو سناؤں گا تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ پاکستان کیوں بنا اور اس کے اسباب کیا تھے.....؟“

رہتے تھے۔ اسی لیے تو ان کا یہ قول مشہور ہوا۔ کام..... کام..... اور کام! بعد میں جب گورنر جنرل کے عہدے کو صدر کے عہدے کا نام دیا گیا تو اُس وقت قائد اعظم اس دُنیا میں نہیں تھے۔ مجھے ایک بات کا ہمیشہ گہرا ڈکھ رہتا ہے۔ اور میں سوچتا ہوں کہ کاش ایسا ہوتا۔ اگر نہیں ہوا تو یہ بھی اللہ کی کوئی مصلحت ہوگی.....“

”مثلاً کسی بات کا دکھ دادا جان؟“ آصف میاں نے بے چین ہو کر پوچھا۔

داداجی نے ایک سر د آہ بھری اور کہنے لگے: ”یہی دکھ کہ قائد ہمیں جلد اکیلا چھوڑ گئے۔ کاش وہ مزید زندہ رہتے۔ ان کی رہنمائی، ان کی موجودگی اور ان کی زندگی سے پاکستان کو کتنا فائدہ پہنچتا، کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ بہر حال خدا کا شکر ہے کہ پاکستان نے ان کے بعد آنے والے مختلف ادوار میں ترقی کی منازل رفتہ رفتہ طے کی ہیں۔ ہم ایٹمی قوت بن گئے ہیں۔ آج



پاکستان کا معیاری وقت

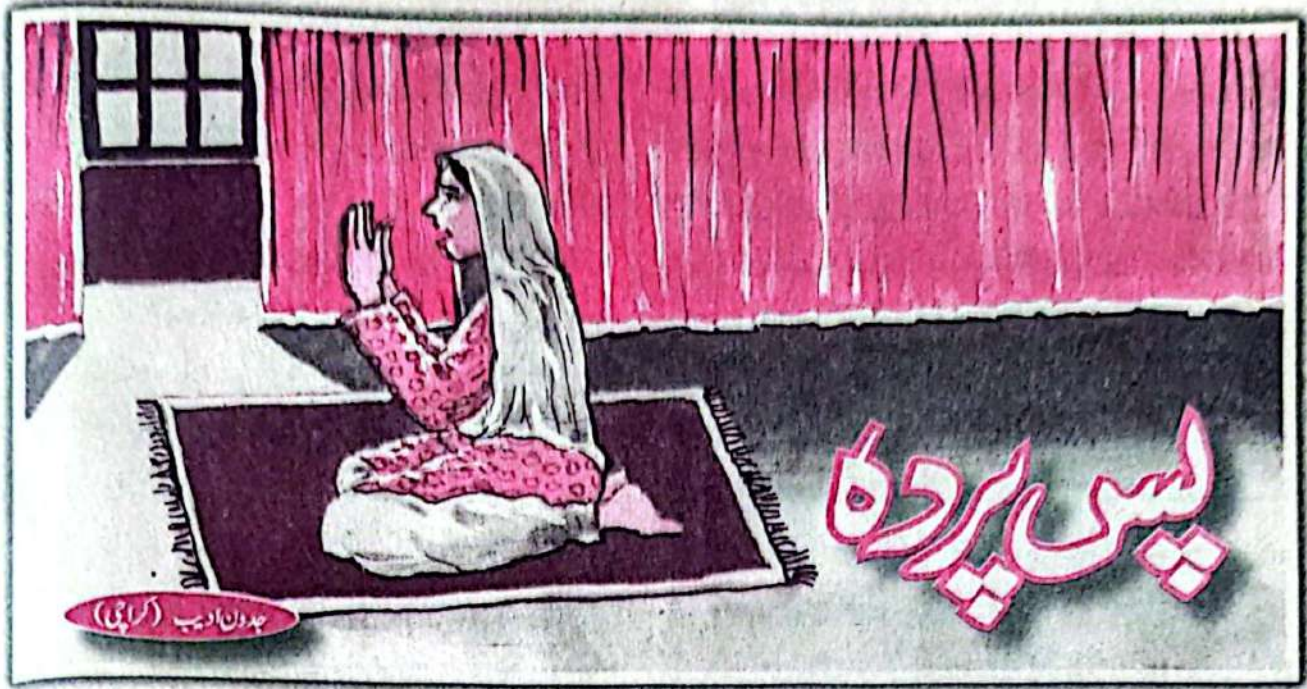
آپ نے اکثر سنا ہو گا کہ اس وقت پاکستان کے معیاری وقت کے مطابق اتنے بج کر اتنے منٹ ہوئے ہیں۔ اور شاید یہ سن کر آپ کے ذہن میں یہ سوال ابھرا ہو کہ معیاری وقت سے آخر مراد کیا ہے؟

کسی بھی ملک کے معیاری وقت سے مراد اُس ملک کے کسی ایسے مقام کا مقامی وقت ہوتا ہے۔ جو کسی خاص طول بلد یا عرض بلد پر واقع ہو پھر اس مقام کا یہ مقامی وقت اس ملک کا معیاری وقت تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ اور سارے ملک میں رائج کر دیا جاتا ہے۔

معیاری وقت مقرر کرنے کی یہ تجویز سب سے پہلے کینیڈا کے ریلوے پلانر اور انجینئر سر سینڈ فورڈ فلمینگ (Sir Sandford Fleming) نے 1870ء میں پیش کی تھی۔ اس تجویز پر غور کرنے کے لئے 1884ء میں واشنگٹن میں 27 ممالک کے نمائندے جمع ہوئے۔ جنہوں نے اس تجویز کو تسلیم کرتے ہوئے برطانیہ کے ایک گاؤں گرینچ (Greenwich) جو صفر درجے عرض بلد پر واقع ہے کہ مقامی وقت کو دُنیا بھر کا معیاری وقت تسلیم کر لیا اور اسے Greenwich Mean Time کہا جانے لگا۔

قیام پاکستان کے بعد پاکستان کے معیاری وقت کے طور پر وہی وقت رائج رہا جو بھارت میں رائج تھا۔ اور جو گرینچ کے معیاری وقت سے ساڑھے پانچ گھنٹے آگے تھا۔ لیکن جلد ہی پاکستان کے ایک ماہر ریاضی پروفیسر محمود انور نے مختلف اعداد و شمار اور جدولوں سے ثابت کیا کہ پاکستان اور بھارت کا معیاری وقت یکساں نہیں ہے۔ بلکہ اس میں نصف گھنٹے کا فرق ہے۔ چنانچہ اُن کی تجویز پر چونڈہ (سیال کوٹ) کے ایک مقام شکر گڑھ جو طول بلد پچھتر درجے مشرق اور عرض بلد بیس درجے شمال پر واقع ہے کہ مقامی وقت کو جو گرینچ کے معیاری وقت سے 5 گھنٹے آگے ہے پاکستان کا معیاری وقت تسلیم کر لیا گیا۔ پاکستان کا یہ معیاری وقت یکم اکتوبر 1951ء کو نافذ کیا گیا تھا۔

(محمد خلیل چودھری، دین)



پس پردہ

مدون ادیب (کراچی)

کچھ نہیں کر پار ہی تھی۔

ڈاکٹر رضوی نے اسٹیٹھسکوپ فہیم کے سینے سے لگایا ہوا تھا۔ وہ پچھلے ایک گھنٹے سے فہیم کے دل کی دھڑکن اور بخار کی کیفیت نوٹ کر رہے تھے مگر خود ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کس قسم کا بخار ہے۔ آخر انہوں نے ایک گہرا سانس لیا اور اسٹیٹھسکوپ ہٹاتے ہوئے بولے:

”ندیم صاحب! میرا خیال ہے ہمیں آج کی رات انتظار کرنا چاہیے، میں نے جو دوا آج صبح سے شروع کی ہے وہ انتہائی موثر دوا ہے اور چوبیس گھنٹے میں اس کے مثبت اثرات لازماً سامنے آتے ہیں۔“

ہم اس قسم کی باتیں پچھلے چھ دن سے سن رہے ہیں۔ ”بیگم ندیم تلخی سے بولیں: ”آخر آپ کی مہارت کو کیا ہو گیا ہے! میں اپنے بچے کو اس طرح ترپتا نہیں دیکھ سکتی! ہمارے پاس کوئی اور آپشن نہیں ہے۔“

ڈاکٹر رضوی نے نرمی سے کہہ آپ جانتی ہیں اور یہ کوئی فخریہ بات نہیں ہے کہ شہر میں مجھ سے سنئیر ڈاکٹر کوئی اور نہیں ہے بلکہ لوگ تو مجھے ملک کا بچوں کا سب سے قابل ڈاکٹر سمجھتے ہیں۔“

”ہم اپنے بچے کو لندن لے کر جانیں گے۔“ بیگم ندیم نے یہ کہتے کہتے ہوئے ندیم صاحب کی طرف مڑ کر دیکھا۔ ”دیکھیے! آپ سے اپنے بچے کے لیے جو ہو سکتا ہے کیجیے!“

ندیم صاحب کے بنگلے میں شہر کے سب سے بڑے ڈاکٹر موجود تھے۔ ڈاکٹر رضوی بچوں کے اسپیشلسٹ تھے۔ اُن کا بہت بڑا ہسپتال تھا اور وہ شہر کے سب سے مہنگے مگر قابل ڈاکٹر مشہور تھے۔ بچوں سے متعلقہ تمام امراض پر انہیں مہارت حاصل تھی۔ وہ اپنے ہسپتال میں ہی ہر قسم کے ٹیسٹ اور آپریشن بھی کرتے تھے۔ ڈاکٹر رضوی سے علاج کے لیے کم از کم ایک دن پہلے ٹوکن لینا پڑتا تھا۔ البتہ وہ فوری نوعیت کے کیس بھی دیکھتے تھے۔

ندیم صاحب اپنے چھ سالہ بیٹے فہیم کا علاج ڈاکٹر رضوی سے ہی کراتے تھے۔ وہ ان کے فیملی ڈاکٹر تھے اور ضرورت پڑنے پر ان کے گھر بھی آجاتے تھے جیسا کہ وہ ابھی آئے ہوئے تھے۔ فہیم کو آج بخار ہوئے چھٹا روز تھا۔ اترتا چڑھتا یہ بخار اب تک ڈاکٹر رضوی کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ پہلے وہ سمجھے تھے کہ یہ موسمی بخار ہے۔ پھر انہیں لگا کہ یہ ملیریا ہے۔ انہیں ٹیسٹوں سے پتا چلا کہ یہ صرف بخار ہے اور بد پرہیزی کی وجہ سے ہوا ہے، لیکن اب تک وہ بخار ختم نہیں ہو پایا تھا۔

بیگم ندیم اگرچہ شہر کی بہت ممتاز سماجی خاتون تھیں لیکن اس وقت ان کی حالت ایک بے بس ماں کی سی تھی۔ وہ اپنے لباس اور وضع کے حوالے سے بہت حساس تھیں مگر اس وقت ان کی کیفیت ایک لاچار ماں جیسی تھی جو اپنے بیٹے کے لیے

ڈاکٹر رضوی نے نرمی سے کہا: "لیکن میں جانتا ہوں کہ وہاں جو سہولتیں اور علاج میسر ہے وہ سب کچھ میرے پاس بھی دستیاب ہے۔"

"پھر کیا کریں ڈاکٹر! ندیم صاحب بے بسی سے بولے:
"آخر کوئی توجہ ہوگی کہ بچے کا بخار ٹوٹ نہیں رہا۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی نیا میٹ یا نئی دوا ہو جو آپ سے رہ گئی ہو۔"
"ایسا کچھ نہیں ہے، البتہ بعض معاملات دوا سے زیادہ یا پھر دوا کے ساتھ دوا کے محتاج ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ہمارے کسی گناہ یا غلطی کی سزا ہمارے بچوں کو مل رہی ہوتی ہے۔ میرا مشورہ ہے آپ صدقہ خیرات بھی کیجئے اور یہ جاننے کی کوشش کریں کہ آپ کی وجہ سے کسی کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔ یہ جاننا اور اس کا مداوا کرنا بھی ضروری ہے۔ مجھے فی الوقت اجازت دیجئے۔ میرا ہسپتال کا ٹائم ہو رہا ہے۔ میں واپسی پر پھر آؤں گا۔ فی الحال کسی نئی دوا کی ضرورت نہیں ہے!"
ڈاکٹر رضوی کے جانے کے بعد بیگم ندیم بولیں:

"ندیم! آپ اپنی فیکٹری کے معاملات دیکھیے۔ میں بھی دیکھتی ہوں کہ مجھ سے نادانستہ کوئی غلطی تو نہیں ہوئی۔"
ندیم صاحب نے اثبات میں سر ہلایا اور فیکٹری جانے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔

آج ندیم صاحب کئی دن کے بعد فیکٹری آئے تھے۔ اس فیکٹری کے علاوہ ان کے متعدد دوسرے کاروبار بھی تھے اور وہ یہاں کم ہی آتے تھے۔ فیکٹری کا نظام ان کا خاص ملازم نجیب شاہ چلاتا تھا۔ اس کی حیثیت ندیم صاحب کی عدم موجودگی میں مالک کی سی تھی۔

"میری عدم موجودگی میں کوئی خاص بات تو نہیں ہوئی! میرا مطلب ہے کوئی ایسی بات جسے جاننا میرے لیے ضروری ہو!"
نجیب شاہ نے ایک لمحے کے لیے سوچا پھر نفی میں سر ہلا کر بولا:
"کوئی خاص بات نہیں ہوئی سر!"

"مزدوری وغیرہ کے معاملات تو درست چل رہے ہیں ناں.....؟" ندیم صاحب نے پوچھا۔

"مزدوری کے معاملات آپ کو پتا ہے ٹھیکیدار کے پاس ہیں۔"

جب سے ٹھیکیداری نظام آیا ہے مالکان بری الذمہ ہو گئے ہیں۔ ٹھیکیدار مزدوروں کا استحصال تو کر رہے ہیں مگر یہ قانون تو حکومت نے ہمیں دیا ہے۔ میں تو خود اس نظام کے خلاف ہوں۔"
"مجھے ایک زیادتی یا کوتاہی کی تلاش ہے!" ندیم صاحب نے نجیب شاہ کو فہم کی بیماری کا بتا کر کہا: "میرا دل کہتا ہے کہ میرے گھر بیماری کی وجہ یہی ہے۔"
"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ یہ عین ممکن ہے۔ میں ٹھیکیدار کو بلاتا ہوں۔ شاید ٹھیکیدار نے کچھ کیا ہوا!"

ندیم صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔ تھوڑی دیر بعد ٹھیکیدار سلام کرتا ہوا اندر داخل ہوا۔

ٹھیکیدار کافی دیر تک ندیم صاحب سے باتیں کرتا رہا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ حکومت نے بہت اچھا کیا جو ٹھیکیداری نظام قائم کیا ہے۔ اب مزدور ایک کاغذ کی مار ہیں۔ نہ وہ کچے ہو سکتے ہیں اور نہ انہیں فیکٹریوں کے منافع سے کچھ حاصل ہے اور نہ ہی پینشن وغیرہ کا چکر بچا ہے۔ پہلے مزدوروں کا مستقبل محفوظ تھا اب مالکان کا محفوظ ہو گیا ہے۔

ندیم صاحب بری طرح چونکے۔ انہیں لگا کہ وہ ایک سرمایہ دار نظام کا حصہ بن گئے ہیں۔ حکومت نے سرمایہ داروں کو تحفظ دینے کے لیے مزدور سے پکا ہونے کا حق چھین لیا تھا۔ انہوں نے سوچا کہ وہ تو اس نظام کو مسترد کر سکتے ہیں۔ اللہ کا دیا سب کچھ انہیں میسر تھا۔ انہوں نے بھی تو بہتی گزگا میں ہاتھ دھویا تھا۔

ندیم صاحب کو محسوس ہوا کہ شاید مزدوروں کے اس استحصال کی سزا ان جیسے سرمایہ داروں کو مل رہی ہے اور قدرت کی اس سزا کو کوئی سمجھ نہیں پایا۔ انہوں نے اپنے منیجر کو بلوایا اور اس سے کہا کہ وہ انفرادی طور پر اپنے ہاں سے ٹھیکیداری نظام ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں جو کوائف ہیں اکٹھے کریں۔ منیجر بہت حیران ہوا مگر اسے ندیم صاحب کے اس عمل سے خوشی محسوس ہوئی تھی۔

منیجر کے جاتے ہی اُن کے فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف بیگم ندیم تھیں۔

"ارے کمال ہو گیا!" وہ ہر جوش لہجے میں بولیں: "فہم

مسکرایا ہے اور اس کا بخار تیزی سے کم ہو رہا ہے..... میں نے ڈاکٹر کو بھی فون کر دیا ہے.....!

”میں فہیم کی بیماری کی وجہ سمجھ گیا ہوں۔“ ندیم صاحب مسکرائے: ”مزدوروں کے استحصا ل نے پورے ملک کے امیر طبقے پر طرح طرح کا عذاب مسلط کر دیا ہے جس کا ہمیں شعور نہیں..... میں نے زیادہ منافع کو ایک طرف رکھ کر مزدوروں کو ان کا حق دینے کا فیصلہ کر لیا ہے.....“

اسی شام ندیم صاحب کی تینوں فیکٹریوں کے باہر مزدور جشن منا رہے تھے اور خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ ان کے گھروں میں چراغاں ہو رہا تھا اور ندیم صاحب اور اس کی اولاد کے لیے

دعا ئیں مانگی جا رہی تھیں اور دوسری طرف ڈاکٹر رضوی فہیم کا چیک اپ کرتے ہوئے شدید حیران تھے۔ آخر وہ بولے:

”میں حیران ہوں..... بچے نے اتنی تیزی سے ریکور کیا ہے کہ میری عقل حیران رہ گئی ہے، واقعی بعض معاملات میں قدرت کی براہ راست مداخلت ہوتی ہے۔ وہ کب کس پر مہربان ہو جائے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“

ندیم صاحب مسکرائے۔ انہوں نے بیگم کی طرف دیکھا وہ بھی مسکرا رہی تھیں۔ دونوں نے فہیم کی طرف دیکھا، وہ چھت کو گھورتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ ڈاکٹر نے سب کو مسکراتے دیکھا تو خود بھی مسکرانے لگے۔

کاشف ضیائی (لاہور)

فقیر کی موت

”جیسے تو مرے گا۔“

فقیر نے کہا: ”میں تو ایسے مردوں گا۔“ یہ کہہ کر اُس نے اپنی لائٹنی ایک طرف رکھی۔ اور زمین پر لیٹ کر اپنے پیالے پر اپنا سر رکھا اور ایک مرتبہ زور سے ”اللہ اکبر“ کا نعرہ لگایا۔

نعرے میں کچھ ایسی تڑپ تھی کہ ساری فضا گونج اٹھی۔

نعرہ لگاتے ہی فقیر کا جسم بے جان ہو گیا۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد دکان کے ملازم باہر آئے اور فقیر کو ہلا جا کر دیکھا تو فقیر کا انتقال ہو چکا تھا۔

شیخ فرید الدین ساکت و جاہد اپنی جگہ پر بیٹھے یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ اُن پر اس واقعے کا گہرا اثر ہوا اور وہ دیر تک گم

سم بیٹھے رہے۔ اس کے بعد شیخ نے ملازموں سے دکان بند کرنے کا کہا اور خود گھر چلے گئے۔ اُن کی وہ رات بڑی بے چینی اور بے قراری میں گزری۔ رات کے آخری حصے میں انہوں نے

اگلے دن انہوں نے اپنی دکان کا سارا مال خدا کی راہ میں صدقہ

☆☆ اُن سے دعا کروانے آیا کرتے تھے۔

احمد عطار بصرہ کے بہت بڑے عطر فروش تھے۔ بہت سے ملکوں میں ان کے تیار کردہ عطرہ جاتے تھے۔ اگرچہ اُن کے خاندان میں دوسرے لوگوں کا پیشہ بھی عطر فروشی تھا، لیکن اس کاروبار میں جو شہرت اور کام یابی عطار کو ملی تھی دوسرے اُس سے محروم تھے۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ فرید الدین عطار دکان میں بیٹھے نوٹ گن رہے تھے۔ اُن کے ملازموں میں سے کچھ تو عطر کی شیشیاں بھر رہے تھے اور باقی مریضوں کی دوا بنا رہے تھے۔

اسی دوران دکان پر ایک فقیر آیا اور فرید الدین سے مخاطب ہو کر کہنے لگا: ”بابا! اللہ کے نام پر کچھ دو۔“

شیخ فرید الدین نوٹوں کی الٹ پھیر میں مصروف تھے۔ انہوں نے فقیر کی آواز پر کوئی توجہ نہ دی۔ فقیر نے دوبارہ کہا: ”بابا! اللہ کے نام پر کچھ دو۔“

شیخ اس مرتبہ بھی متوجہ نہ ہوئے۔ تیسری مرتبہ پھر ایسا ہوا تو فقیر گرج کر بولا:

”خدا کے بندے! تیری جان عطر کی بوتلوں میں بھنسی ہوئی ہے۔ آخر تو کیسے مرے گا۔“ شیخ کو اُس کی اس بات پر سخت غصہ آیا انہوں نے بھی گرج کر جواب دیا:

سیرۃ و اشعار

آپ کے پسندیدہ اشعار پر مبنی "تعلیم و تربیت" کا لیا دل چسپ سلسلہ

دعا بہار کی مانگی تو اتنے پھول کھلے
کہیں جگہ نہ رہی میرے آشیانے میں
(قمر ناز دہلوی، کراچی)

آنسو نکل پڑے تو میری لاج رہ گئی
اظہار غم کا درنہ سلیقہ نہ تھا مجھے
(ماہین آصف، اسلام آباد)

کمال ہے جو ازل سے وہ ہے کمال تیرا
باقی ہے جو ابد تک ، وہ ہے جلال تیرا
دل میں عشق نبی کی ہو ایسی لگن
روح تڑپتی رہے دل مچلتا رہے
(محمد خالد صابری، لاہور)

شہیدوں کے لبو سے جو زمین سیراب ہوتی ہے
بڑی زرخیز ہوتی ہے بہت شاداب ہوتی ہے
اس قوم کی پیشانی پہ لکھی ہے تباہی
جس قوم کے کتب کی فضا ٹھیک نہ ہوگی
(محمد خالد صابری، لاہور)

عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں
گھن کی صحت یہ تعصب تجھے کھا جائے گا
اپنی ہر سوچ کو محسن نہ علاقائی کر
(محمد فرخ حیات، پیر محل)

دیکھا تو سب ہی لعل و جواہر لگے مجھے
پرکھا جو دوستوں کو تو اکثر میں کچھ نہ تھا
مانا ہمیں جینے کا قرینہ نہیں آتا
لے زیت مگر تجھ سے ہمیں پیار بہت ہے
(محمد رشاد خان، منگلا)

دیکھا تو سب ہی لعل و جواہر لگے مجھے
پرکھا جو دوستوں کو تو اکثر میں کچھ نہ تھا
درا کو اپنی موج کی طغیانوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے
(طیب رزاق، بھمبر)

دیتی ہے قتل اکثر چہروں کی چمک دھوکا
ہر کالج کے کٹڑے کو ہیرا نہ کہا جائے
کتنی صدیوں کو سزاؤں سے گزرتا ہو گا
ایک لمحے میں ہوئی جو خطا ٹھیک نہیں
(عمر خان، راول پنڈی)

نہیں ہے چیز ٹکئی کوئی زمانے میں
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں
صبرا کی دھوپ میں ہمیں سایہ نہ مل سکا
جتنے ملے درخت سبھی کھوکھلے ملے
(ہارون الرشید، جہلم)

گرج برس کے بھی طوفان انہیں مٹا نہ سکا
بلا کا عزم تھا ان ڈولتے سفینوں میں
اتنی دہشت ہے کہ دیران گلی کوچوں میں
اپنا سایہ بھی نظر آئے تو ڈر لگتا ہے
(ماہم افتخار، پشاور)

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسم محمد سے اجالا کر دے
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تانجاک کا شجر
(حماس بدر، اسلام آباد)

دہر میں اسم محمد سے اجالا کر دے
دہر میں اسم محمد سے اجالا کر دے
میں رہوں اور میرا نام و نسب ہو باقی
صرف اسی سوچ میں رہتا ہے ہر آنے والا
(مریم خالد، لاہور)

دہر میں اسم محمد سے اجالا کر دے
دہر میں اسم محمد سے اجالا کر دے
میں رہوں اور میرا نام و نسب ہو باقی
صرف اسی سوچ میں رہتا ہے ہر آنے والا
(جلاوید بشیر احمد، تربت مکران)

محمد نادر دانی (حیدر آباد)



اقبال ایک عظیم شاعر



بھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔

اقبال کی ہانگ درامیں بچوں کے لئے پہلی نظم ایک مکر اور مکھی ہے، جو کہ ماخوذ ہے۔ اس میں کہانی کے ذریعہ یہ بتایا گیا ہے کہ مکر کیا عیار ہے؟ اُس نے مکھی کو کس طرح اپنی باتوں میں الجھایا؟ مکرے کی خوشامد پسندی کس طرح مکھی کو موت کے منہ میں لے گئی۔ اس نظم کے ذریعہ یہ پیغام دیا گیا کہ بلاوجہ کسی کی چکنی چڑی باتوں میں نہیں آنا چاہیے؟ اس سے انسان ہلاکت میں پڑ سکتا ہے۔ خوشامد کرنے والے کی نیت کا علم نہیں ہو سکتا کہ وہ آپ سے کیا فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے؟ ایک پہاڑ اور گلہری بھی ایک ماخوذ نظم ہے۔ یہ ایمرن کی نظم سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ گلہری نے سچ کہا تھا، دُنیا میں کوئی چھوٹا ہے نہ بڑا۔ تکبر، بے کار کی چیز ہے، اللہ تعالیٰ نے دُنیا میں کوئی چیز بے کار اور نکمی نہیں بنائی، دُنیا میں آنے والی ہر شے کار آمد ہے۔ قدرت کی نظر میں سب برابری کا درجہ رکھتے ہیں۔

ایک گائے اور بکری، بھی ایک ماخوذ نظم ہے۔ اس میں بکری کی فصاحت بھی کیا خوب ہے کہ گائے کو محنت مشقت تو

شاعر مشرق علامہ محمد اقبال کے نام سے کون واقف نہیں۔ انہوں نے پاکستان کا خواب دیکھا جو بالآخر شرمندہ تعبیر ہوا۔ اقبال کا پہلا مجموعہ کلام جو شائع ہو کر بازار میں آیا وہ ”بانگ درا“ ہے۔ اقبال نے بچوں کے لیے بارہ نظمیں لکھی ہیں جو ”بانگ درا“ کے حصہ اول میں شامل ہیں۔ ان میں سے چھ نظمیں ماخوذ ہیں جب کہ تین نظمیں طبع زاد ہیں۔ اس کے علاوہ ایک ہندوستانی بچوں کا قومی گیت ہے اور ساتھ میں دو ترانے بھی ہیں ان میں ایک ”ترانہ ہندی“ اور دوسرا ”ترانہ ملی“ کے عنوان سے ہے۔ ان کی دو نظمیں ”ایک پرندہ اور جگنو“ اور ”دعا“ بڑے بچوں کے لیے ہیں۔ علامہ اقبال نے بچوں کے لیے جو نظمیں لکھی ہیں، اُن میں اخلاقِ حسنہ یعنی عمدہ عادتوں کا تصور موجود ہے۔

اقبال نے دوسری زبان کے ادب سے بچوں کے لیے چھ نظموں کو اُردو کے قالب میں ڈھالا ہے اور زبان ایسی سلیس اور سادہ رکھی ہے جو بچوں کی نفسیات کے عین مطابق ہے۔ ان کو بچے آسانی سے سمجھ بھی لیتے ہیں اور مزے لے لے کر پڑھتے بھی ہیں۔ ان نظموں سے بچوں کے علاوہ بڑے بوڑھے

کرنا پڑتی ہے مگر اس کے عوض اس کی دیکھ بھال بھی ہو رہی ہے۔ اپنے محسنوں کا احسان ماننا بے حد ضروری ہے۔ انسان ایک دوسرے کے ساتھ آپس میں باہم مربوط رکھے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کے معاملات نمٹانے میں ہمیں ایک دوسرے کی ضرورت بھی پڑتی ہے۔

نظم بچے کی دُعا اگرچہ ماخوذ ہے لیکن یہ ہر بچے کے دل کی دُعا ہے۔ کون نہیں چاہتا کہ اس کے علم و عمل کی روشنی سے ہر جگہ اُجالا ہو جائے۔ اپنے وطن کی خوش حالی اور اس کے پھلنے پھولنے کی دُعا کون سا بچہ نہیں کرتا۔ یہ دُعا ایسی ہے جو پاک و ہند کا شاید ہی کوئی مدرسہ ہو، جہاں تعلیم سے پہلے یا کسی تقریب کی ابتدا میں اس کو پڑھنا نہ جاتا ہو۔ اس کی بحر بھی کیا خوب ہے، دھن بھی کیسی خوب کہ بچے آپ ہی آپ اسے اُلاپتے ہیں اور سننے والے لطف اٹھاتے ہیں۔

سچ کہا ہے جس نے کہا، دُکھ کے بعد سکھ۔ جگنو کی مثال سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہم دردی کے معنی ہیں دُوسروں کی بے لوث خدمت کرنا۔ نظم ”ہم دردی“ ولیم کوپر کی نظم سے ماخوذ ہے۔ اس میں علامہ کا یہ پیغام ہے کہ دُنیا میں وہی لوگ معتبر اور قابلِ تحسین ہیں جو وقت پڑنے پر دُوسروں کے کام آتے ہیں۔

ماں کا خواب، میں علامہ یہ احساس دلاتے ہیں کہ کسی عزیز کی موت پر صرف اس کی یاد میں آنسو بہاتے رہنا نہ صرف اپنے کام کاج سے انسان کو عاری کر دیتا ہے بل کہ یہ رونا دھونا مرنے والے کے لیے بھی ایذا رسانی کا باعث بنتا ہے۔ ہوتا یہ چاہیے کہ مرنے والے کی وفات پر صبر سے کام لیا جائے۔ یہ نظم بھی ماخوذ ہے۔

علامہ کی نظم پرندے کی فریاد، یہ احساس دلاتی ہے کہ آزادی صرف انسانوں ہی کے لیے نہیں بل کہ ہر جان دار اور ہر ذی شعور کے لیے ضروری ہے۔ پرندے اور جانور بھی اپنے اندر آزادی کی تڑپ اور طلب، عام انسانوں کی طرح رکھتے ہیں اور ہر وقت آزاد ہونے کی دُعا کرتے رہتے ہیں۔ جن لوگوں کو آزادی میسر ہو تو انہیں اُس کی قدر کرنا چاہیے۔

علامہ کی یہ نظم طبع زاد ہے۔

ایک پرندہ اور جگنو، میں علامہ اقبال نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس دُنیا کی رونقیں مل جل کر رہنے میں ہیں۔ دُنیا میں رواداری اور خلوص و محبت کے ساتھ رہا جائے اور ایک دوسرے کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے آپس میں عزت و احترام کو ملحوظ خاطر رکھا جائے۔ یہ نظم بھی طبع زاد ہے۔

ترانہ ملی میں اقبال یہ پیغام دے رہے ہیں کہ ملتِ اسلامیہ کو کوئی قوت مٹا نہیں سکتی۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ ہم ایک اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ماننے والے ہیں۔ توحید کی امانت ہمارے سینوں میں پوشیدہ ہے، پھر بھلا کوئی ہمارا کچھ کیوں کر بگاڑ سکتا ہے؟ ضرورت ہے تو اس بات کی کہ ہم منظم و متحد رہیں۔

بزمِ انجم، میں علامہ کا کہنا ہے کہ ہماری کائنات کا سارا نظام خالقِ کائنات نے باہم اتحاد اور اتفاق پر مبنی رکھا ہے۔ دُنیا میں وہی اقوام کام یاب ہیں جو اتحاد و یگانگت کی طرف مائل ہیں اور سب کے ساتھ مل کر باہم متحد و منظم رہتی ہیں۔ پھر ایسی قوم کو کوئی دشمن بھی منتشر کرنے میں ہرگز کام یاب نہیں ہو سکتا۔

”خطاب بہ جوانانِ اسلام“ نظم میں علامہ اقبال مسلمانوں کی تاریخ بیان کرتے ہوئے اپنے اجداد کی خوبیوں کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ ہمارے نوجوانوں میں کیا کیا خوبیاں تھیں اور موجودہ دور کے مسلم نوجوانوں کو اس بات کا احساس دلایا جائے کہ دُنیا میں رہنے اور پنپنے کے لیے اپنے اسلاف کے کارناموں سے سیکھ کر انہی کے نقشِ قدم پر چل کر اپنے وطن کی تعمیر و ترقی میں حصہ لیا جاسکتا ہے۔

اپنی دُعا میں بھی علامہ اقبال دلی طور پر اس بات کے تمنائی ہیں کہ اللہ تعالیٰ موجودہ دور کے مسلمانوں کو اپنے بزرگوں کے اعلیٰ اوصاف عطا کرے اور ان کے دلوں میں دین کی تڑپ پیدا کر دے وہ اپنے دین اور وطن کی خدمت کے جذبے سے ہمیشہ سرشار رہیں اور اس کی سر بلندی کے لیے کسی بھی قسم کی قربانی سے دریغ نہ کریں۔

علامہ اقبال نے اردو میں شاعری کے ساتھ ساتھ بچوں اور نوجوانوں کے لیے فارسی میں بھی نظمیں کہی ہیں جن کے ذریعہ انہوں نے اُن کی اصلاح اور تربیت کا فریضہ انجام دینے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ وہ آج کے نوجوانوں کے اندر ہمت اور حوصلہ بیدار کر کے انہیں امت مسلمہ اور اپنے وطن کی خاطر کچھ کر گزرنے کا درس دیتے ہیں۔

ان کی چند مشہور نظموں کا مختصر ا ذکر کرتے ہیں۔

ان کی ایک نظم فاطمہ بنت عبد اللہ ہے۔ یہ ایک سچے واقعہ پر مبنی ہے جو تقریباً ایک صدی قبل یبیا میں جنگ طرابلس میں پیش آیا تھا۔ فاطمہ بنت عبد اللہ جیسی معصوم اور پاکیزہ کردار لڑکی نے جنگ میں زخمیوں کو پانی پلانے کی خدمت انجام دی۔ وہ تن دہی کے ساتھ اپنی خدمات انجام دے رہی تھی کہ ایک اطالوی سپاہی نے اس کا گریبان پکڑ کر اسے روکنا چاہا جس پر اُس نے بھر کر زخمی سپاہی کی تلوار سے وار کر کے اس کا ہاتھ کاٹ ڈالا جس پر طیش میں آ کر سپاہی نے گولیوں سے اُسے چھلنی کر ڈالا۔

علامہ اقبال جہاں مسلمانوں کے زوال پر رنجیدہ ہوتے ہیں، وہیں فاطمہ کی بہادرانہ شہادت سے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بہ جانب ہیں کہ اگر مسلم معاشرے میں فاطمہ جیسی بے خوف، نڈر اور جہاد کے جذبہ سے سرشار لڑکیاں موجود ہیں تو پھر ہمیں مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس نظم کے ذریعہ اقبال مسلمان بچوں کے اندر یہ جذبہ ابھارنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ وہ ہر وقت خدمت کے جذبہ سے سرشار رہیں اور اپنے مسلمان بھائیوں کی خدمت کے لیے ملنے والا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں۔

اپنی ایک اور نظم پروانہ اور جگنو میں اقبال نے دو پتنگوں کے درمیان ایک مکالمہ تحریر کیا ہے۔

پروانہ کہتا ہے کہ میں ایک بلند مقصد کے لیے سرگرم ہوں اور اپنی شمع حاصل کرنے کے لیے سرتوڑ کوشش کرتا ہوں اور اپنے اس مقصد کی تکمیل کے لیے اپنی جان بھی دینے سے گریز نہیں کرتا جب کہ تمہارے اندر کوئی حرارت نہیں

ہے اس لیے تم میرے مقابلہ میں کم تر ہو۔

جگنو جواب میں کہتا ہے کہ پروانہ اپنے جل مرنے پر اترا کر اپنے آپ کو معتبر جانتا ہے حال اُن کہ وہ جل مرنے کے لیے بھی دوسروں کا دستِ نگر ہے جب کہ میرے پاس تھوڑی یا زیادہ جیسی بھی روشنی ہے وہ اپنی ہے اور میں اس سے دوسروں کو فیض پہنچاتا ہوں، مجھے کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کرنا پڑتا، اس طرح میری خودی متاثر نہیں ہوتی۔ اقبال نے اس نظم کے ذریعہ یہ درس دیا ہے کہ جہاں تک ہو سکے، انسان کو اپنے معاملات خود نمٹانے چاہیں اور کسی کے در کا سوالی نہیں بننا چاہیے۔ یہ خودی کا درس ہے۔

کتابی کیڑے کی کہانی، میں اقبال لکھتے ہیں کہ ایک رات وہ اپنے کتب خانے میں مطالعہ میں مصروف تھے کہ انہیں کتاب کے اندر موجود کیڑے کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے کان لگا کر سنا تو علم ہوا کہ وہ کتابی کیڑا، ایک پروانے سے کہہ رہا تھا کہ میں نے بو علی سینا جیسے بڑے عالم اور ابو نصر فارابی جیسے فلسفیوں کی کتابوں میں بسیرا کیا ہے لیکن سچ جانو کہ میں ایسی ایسی عالمی شخصیات کے ساتھ رہ کر بھی زندگی کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکا ہوں۔ یوں جان لو کہ کتابوں تک سورج کی روشنی نہ پہنچنے کی وجہ سے میں تاریکی میں ڈوبا رہتا ہوں۔

پروانہ جو کہ شمع کے گرد چکر لگا لگا کر نیم جان ہو چکا تھا، مسکرا کر بولا کہ بھائی! یہ زندگی کوئی گری پڑی شے نہیں کہ جو تمہیں ادھر ادھر کتابوں میں مل جائے۔ زندگی ایک بہت بڑی دولت ہے جسے حاصل کرنے کے لیے ایک خاص تڑپ، ایک خاص جستجو کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ تڑپ ہی انسان کو پیشگی کی زندگی فراہم کرتی ہے۔ اگر تم بلند پروازی کی خواہش رکھتے ہو تو اپنے اندر ایسی تڑپ پیدا کرو اور اس مقصد کے لیے ان کتابوں سے نکل کر باہر کی دنیا میں آؤ۔

اس نظم کے ذریعہ علامہ نے ایسے انسانوں کی طرف توجہ دلائی ہے جو کتابی علم تو رکھتے ہیں لیکن قوتِ عمل اور کچھ کر گزرنے کے جذبات سے عاری ہوتے ہیں۔

---☆☆---



”کیا ہوا.....؟“ تنویر ہنسا۔

”کچھ نہیں.....“ میں نے اُسے ٹال دیا اور پوچھا۔

”آپ کے والد صاحب کی طبیعت اب کیسی ہے؟“

”اللہ نے اپنا فضل کیا اب کوئی خطرہ نہیں، آپ کے عزیز

اب کیسے ہیں؟“

”وہ بھی صحت مند ہو چکے ہیں، اللہ تعالیٰ سب کو اپنی

حفاظت میں رکھے.....“

میری بات کے جواب میں اُس نے کہا:

”آمین!“ پھر ادھر ادھر کی باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

تقریباً ایک ماہ پہلے تنویر سے میری ملاقات ہسپتال میں

ہوئی تھی۔ میرے سسر کی آنکھ میں سفید موتیا اتر آیا تھا۔

علاج کی عرض سے میں انہیں لاہور کے ایک اچھے ہسپتال میں

لے آیا تھا۔ اُن کا اکلوتا بیٹا ابھی کم عمر تھا اس لیے یہ ذمہ داری

نبھانے کا فیصلہ میں نے کیا تھا۔ یہاں تین دن گزارنے کے بعد

مجھے احساس ہوا کہ جس انسان کے دل میں نرمی نہیں، گداز

نہیں اُسے دو مقامات پر ضرور جانا چاہیے۔ ایک تو ہسپتال اور

دوسرا قبرستان کیوں کہ ہسپتال جا کر اُسے معلوم ہو گا کہ

زندگی کتنی قیمتی ہے۔ اور قبرستان جا کر اُسے معلوم ہو گا کہ

زندگی کتنی بے قیمت ہے۔

میں ابھی تک یہی سمجھ رہا تھا کہ تنویر کے ساتھ یہ میری

دوسری ملاقات ہے۔ لیکن ایسا نہیں تھا اور اس بات کا احساس

مجھے اُس کے گھر آنے کے بعد ہوا۔ میں جیسے ہی مہمانوں کے

بیٹھنے والے کمرے میں داخل ہوا۔ حیرت کا ایک شدید جھٹکا مجھے

لگا۔ یہ جھٹکا ہر آنے والے مہمان کو لگتا ہو گا، لیکن میرے

حوالے سے یہ جھٹکا اس لیے بھی شدید تھا کہ میں یہاں موجود

ایک کہانی کا حصہ تھا۔ اور مجھے یقین تھا کہ یہ کہانی تنویر مجھے

سنائے گا۔

کمرے میں موجود تمام چیزیں خوب صورتی کے ساتھ

سجائی گئی تھیں۔ لیکن آنکھوں کا محور ایک ہی چیز تھی۔ یہ

مخصوص قسم کے جوتوں کی ایک جوڑی تھی۔ جو کھیلوں میں

استعمال ہوتے ہیں۔ تین فٹ کی لکڑی کی خوب صورت میز پر

یہ جوتے سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔ مزید آرائش یہ کی گئی

تھی کہ شیشے کے چوکور بکس سے جوتوں کو ڈھانپ دیا گیا تھا۔

جوتوں کو دیکھتے ہی میرے بایں رخسار پر جلن ہونے لگی۔

تنویر میری ذہنی حالت کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اور ساتھ

ہی وہ بہت بے تاب نظر آ رہا تھا کہ میں اُس سے جوتوں کے

متعلق سوال پوچھوں اور وہ مجھے وہ کہانی سنائے جس سے میں

آگاہ تھا۔ غیر ارادی طور پر میں نے اپنا ہاتھ رخسار پر رکھ لیا۔

طبی معائنے کے بعد میرے سسر کو ہسپتال میں داخل کر لیا گیا۔ خوش قسمتی سے ایک بیڈ خالی تھا۔ رات ہوئی تو سونے کے لیے میں اُس بیڈ پر لیٹ گیا۔ رات کا پچھلا پہر تھا جب کسی نے مجھے جھنجھوڑ کر اٹھایا۔

”جناب! ایک نیا مریض آگیا ہے۔ اس کے لیے آپ یہ جگہ خالی کر دیجئے۔“

میں فوراً ہی اُٹھ کھڑا ہو۔ میں نے دیکھا وہ ایک بزرگ صورت آدمی تھا۔ اُس کے ساتھ ایک دبلا پتلا جوان تھا جو شاید اس بزرگ کا بیٹا تھا۔ بزرگ کی آنکھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی جو خون آلودہ تھی۔ تکلیف کی وجہ سے وہ بزرگ کراہ رہا تھا۔

”انہیں کیا ہوا ہے؟“ میں نے اُس جوان سے پوچھا۔
”کیا بتاؤں بھائی..... ان کو آنکھ میں تکلیف تھی۔ انہوں نے ایک نیم حکیم سے دوا لے کر آنکھ میں ڈالی۔ آنکھ میں خارش ہوئی تو انہوں نے آنکھ کو مسل دیا۔ بس پھر خون جاری ہو گیا اور میں انہیں لے کر یہاں چلا آیا.....“

اس جوان کا نام تنویر تھا۔ رات کا باقی حصہ ہم نے باتوں میں گزار دیا۔ ہمارا تعلق ایک ہی شہر سے تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ہماری رہائش گاہوں کے درمیان تین کلو میٹر کا فاصلہ تھا۔ وہ چہرہ تیار کرنے والی سب سے بڑی فیکٹری میں مزدوروں اور کاریگروں کا انچارج تھا۔

اگلے دن تمام مریضوں کو آپریشن تھیر لے جایا گیا۔ یہ کل پندرہ مریض تھے جن کے آج آپریشن ہوتا تھا۔ مریضوں کے لواحقین بے تابی سے راہ داری میں چکر لگا رہے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ بھیڑ میں بھی جیسے سب تنہا تنہا ہوں۔ اس نازک وقت میں تنویر اور میں ساتھ ساتھ تھے۔ ہم بہت کم وقت میں ہم اچھے دوست بن چکے تھے۔ پھر تنویر کے ابو آپریشن تھیر سے باہر نکلے تو اُن کی آنکھ ضائع ہو چکی تھی۔ میرے سر کی آنکھ کا کام یاب آپریشن ہوا تھا۔ ہم ایک بار پھر وارڈ میں موجود تھے، ایسے میں مجھے محسوس ہوا کہ تنویر کچھ پریشان ہے۔

”کیا بات ہے تنویر.....؟“ میں نے پوچھا۔

”دوست ایک ابھرنے ہے۔ شاید تم میری مدد کر سکو.....“

”بتاؤ تو سہی بات کیا ہے؟“ میں نے دوبارہ اصرار کیا۔

”بات یہ ہے کہ جب ابو کو تکلیف ہوئی تو رات بارہ بجے کا

وقت تھا۔ اس وقت میرے پاس تین ہزار روپے موجود تھا۔ دو

ہزار روپے تو گاڑی والے نے لے لیے۔ باقی ایک ہزار روپے

ادویات اور کھانے پینے پر صرف ہو گیا ہے۔ رات پھر ہونے

والی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ گھر جاؤں کچھ ضروری سامان اور

نقد رقم لے کر واپس لوٹ آؤں۔ پھر سوچتا ہوں کہ ابو کا خیال

کون رکھے گا.....“

”میں ہوں نا..... تم فکر مت کرو۔ تمہارے ابو میرے

لیے بھی محترم ہیں۔ میں ان کا خیال رکھوں گا۔“

تنویر کی آنکھوں میں تشکر کے جذبات اُٹھ آئے تھے۔ پھر

وہ چلا گیا۔ اب میرے ذمے دو مریضوں کی تیمارداری تھی جو

میں نے احسن طریقے سے نبھائی۔ اگلی صبح تنویر لوٹ آیا۔ شام

کو ہمیں ہسپتال سے چھٹی مل گئی۔ تنویر نے مجھے اپنا پتہ دیا اور

کہا:

”دوست! زندگی میں کبھی میری ضرورت پڑے تو

تمہارے کام آکر مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ ویسے ہم ایک ہی شہر

میں رہتے ہیں تو ملاقات ہوتی رہے گی.....“

”ضرور.....“ میں نے مسکرا کر کہا اور پھر گلے مل کر اچھی

یادوں کو اپنے دل میں بسائے ہم رخصت ہو گئے اور پھر ایک ماہ

بعد ہی مجھے تنویر کی ضرورت پڑ گئی۔ میرا بھتیجا نوکری کی تلاش

میں تھا۔ اُس نے چڑا بنانے والی فیکٹری میں کام کرنے کی

خواہش کا اظہار کیا تو فوراً ہی مجھے تنویر یاد آگیا۔

”تمہاری نوکری کچی..... وہاں میرا دوست کام کرتا ہے۔

میں اس سے بات کروں گا اور پھر تمہیں فوراً ہی کام پر رکھ لیا

جائے گا.....“ وہ خوش ہو گیا۔ اور اب میں اسی کام کے سلسلے

میں تنویر کے پاس آیا تھا۔ تنویر نے مجھے خوش آمدید کہا تھا اور

اب جو توں کی یہ جوڑی دیکھ کر میں اپنے یہاں آنے کا مقصد

ی بھول گیا تھا۔ تنویر منتظر تھا کہ میں اُس سے جو توں کی بابت

سوال پوچھوں۔ میں نے اس انتظار کو زیادہ طول نہیں دیا۔

”میں نے پہلی بار دیکھا ہے کہ کوئی جو توں کو اپنے کمرے کی آرائش کا حصہ بنائے.....“ تنویر کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

”دوست اس کی وجہ میں چاہتا ہوں کہ میرے گھر آنے والے ہر آدمی کو خبر ہو کر میرا ماضی کیسا تھا۔ اور اب میرا حال کیسا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ جذبہ ہر انسان کے دل میں پیدا ہو جائے جو میرے دل میں تھا.....“

میرے دل میں تنویر کے لیے عزت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ احسان فراموش آدمی ہر گز نہیں تھا۔

”میری عمر اس وقت گیارہ سال کی تھی.....“ اُس نے میرا سوال نظر انداز کر دیا۔

”ہمارے گھریلو حالات کچھ خاص اچھے نہیں تھے۔ عید قربان نزدیک تھی۔ عید الفطر پر میری امی نے مجھے ایک سوٹ خود ہی سی کر دیا تھا، لیکن میرے پاس جوتے نہیں تھے۔ ایک دن میں بازار آیا تو میں نے جوتوں کا یہ جوڑا دیکھا دکان دار نے جوتوں کی سیل لگائی تھی۔ سیل میں ان جوتوں کی قیمت پچاس روپے تھی۔ یہ رقم میرے پاس موجود نہیں تھی۔ میں نے امی سے ضد کی تو انہوں نے مجھے ڈانٹ دیا۔ گھریلو حالات ہی کچھ ایسے تھے۔ پھر مجھے ایک ترکیب سوچی۔ میں روزانہ ملنے والا جیب خرچ جمع کرنے لگا۔ میں سکول جاتا تھا میرے دوست گولیاں، ٹافیاں کھاتے تھے۔ میرا دل لپچاتا تھا لیکن میں خود کو روک لیتا.....“

یہ کہتے ہوئے تنویر کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ زندگی ہر گز اتنی خوب صورت نہیں ہے جتنی اس انسان کو نظر آتی ہے۔ جو کبھی مالی مشکلات سے نہیں گزرا۔

”میرے سامنے ایک مقصد تھا۔ مجھے جوتے حاصل کرنا تھے۔ میں روزانہ بازار جاتا تھا۔ اس ڈر کے ساتھ کہ کہیں جوتے فروخت نہ ہو گئے ہوں پھر جوتوں کو اپنی جگہ پر دیکھ کر مجھے سکون ملتا تھا۔ بیس دن گزر گئے۔ اگلا دن عید الاضحیٰ کا تھا جب میں مطلوبہ رقم جمع کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ پھر میں بازار چلا گیا۔ جب میں دکان پر پہنچا تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میری دنیا لٹ گئی ہو۔ جوتوں کا یہ جوڑا کوئی اور خرید رہا

تھا۔ وہ میری عمر کا ہی ایک لڑکا تھا۔ اُس لڑکے کے ساتھ اُس کے والد صاحب موجود تھے جو جوتے کی قیمت دکان دار کو ادا کر رہے تھے۔ مجھ پر دیوانگی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ میں لپک کر اُن کے پاس پہنچا اور اس لڑکے کے ہاتھ سے جوتے چھین لیے۔

”یہ میرے ہیں۔ انہیں میں نے اپنے لیے پسند کیا ہے.....“ سب حیرت زدہ ہو گئے۔

”لڑکے تمہارا دماغ ٹھیک ہے.....“ دکان دار مجھے ڈانٹ رہا تھا۔

”آپ مجھ سے قیمت لے لیجئے۔ میں نے بیس دنوں تک اپنا جیب خرچ جمع کیا ہے.....“ میں رونے لگا۔

دکان دار بولا:

”لڑکے چیز اسی کی ہوتی ہے جو پہلے قیمت ادا کر دے.....“

اتنا کہہ کر دکان دار دکان کے اندر چلا گیا وہ آدمی اپنے بیٹے کی انگلی تھام کر آگے بڑھنے لگا، لیکن وہ لڑکا پلٹ کر میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں رو رہا تھا اپنے مقصد میں ناکامی میرا مقدر بن چکی تھی۔ جیب میں موجود رقم بے قیمت ہو چکی تھی۔ وہ لڑکا کافی دُور نکل گیا تھا۔ پھر میں نے دیکھا وہ لڑکا دوڑتا ہوا میری طرف آرہا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی جوتے اس لڑکے کے ہاتھ میں موجود تھے۔ میرے قریب پہنچ کر وہ لڑکا ہانپتے ہوئے بولا:

”رُونا نہیں..... رونا نہیں..... کل عید کے روز تم یہ جوتے پہن لینا۔ میں اپنی پرانی چپل پہن لوں گا لیکن تم رونا نہیں..... رونا نہیں.....“

وہ لڑکا جوتے مجھے تھا کر واپس بھاگ گیا اور میں اُسے جاتے ہوئے دیکھتا ہی رہ گیا۔ پھر عید آئی میں نے یہ جوتے پہنے اس کے بعد میں نے ان جوتوں کو احتیاط سے رکھ لیا۔ اُس نامعلوم دوست کا تحفہ سمجھ کر..... اُس دوست کی یاد سمجھ کر..... جانے اب وہ کہاں ہو گا اس دوست کے ایثار کی یہ کہانی یہاں ختم ہو جاتی ہے.....“ پھر تنویر کا سر جھک گیا۔

”آگے کی کہانی مجھ سے سنو.....“ چند لمحوں کی خاموشی

”ابو اکل عید کا دن ہے۔ آپ ہی نے تو کہا تھا کہ عید کا دن ہمیں سبق دیتا ہے کہ اللہ کی راہ میں ہم اپنا جان اور مال قربان کر دیں۔ میں نے تو پھر اپنی ایک چھوٹی سی خوشی قربان کی ہے۔“ ابو کا سر جھک گیا۔ ان کا غصہ ایک لمحے میں ختم ہو گیا اور پھر انہوں نے مجھے گلے سے لگا لیا۔“

میرے آنسو نکل آئے تھے۔ پھر تصویر نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ وہ جان چکا تھا کہ میں ہی وہ لڑکا تھا۔

گھر لوٹتے ہوئے میرا دل بہت مطمئن تھا۔ میں نے تصویر کو اپنے آنے کا مقصد نہیں بتایا تھا۔ اگر میں اُسے اپنی آمد کا مقصد بتا دیا تو شاید میں اپنی ہی نظروں میں گر جاتا۔

کے بعد میں بولا وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔
”وہ لڑکا جو تے تمہارے حوالے کرنے کے بعد جب اپنے ابو کے پاس پہنچا تو اُس کے ابو بہت غصے میں تھے۔ خالی ہاتھ اپنے بیٹے کو دیکھ کر وہ سخت لہجے میں بولے: ”جو تے کہاں ہیں؟“
”وہ تو میں نے اس لڑکے کو دے دیئے جو ان جو توں کے لیے بہت رو رہا تھا۔“

ابو نے ایک تھپڑ بیٹے کے رخسار پر جڑ دیا۔
”نالائق بڑی مشکل سے میں اتنا کما پاتا ہوں کہ تمہاری خواہش پوری کر سکوں اور تم دوسروں کی خوشی پر اپنی خوشی قربان کر رہے ہو“ تھپڑ کی تکلیف سے وہ رونے لگا۔ پھر بولا:



خرگوش ایک معصوم اور بھولا بھالا جانور ہے۔ دیکھنے میں خوب صورت مگر زیادہ تر خاموش رہتا ہے۔ شاذ و نادر ہی اس کی آواز سنائی دیتی ہے۔ خرگوش تیز بھاگتا ہے۔ اس کے کان لمبے ہوتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے لوگ اسے گدھے کا رشتے دار بھی کہتے ہیں۔ کیوں کہ گدھے کے کان بھی لمبے ہوتے ہیں۔ خرگوش کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اُس کے اوپر والے ہونٹ میں دراڑ ہوتی ہے۔ اس کی پچھلی ٹانگیں لمبی ہوتی ہیں جو اُسے تیز بھاگنے میں مدد دیتی ہیں۔ اس کی آنکھیں موٹی ہوتی ہیں۔ اس کی دم روئی کے گالے کی مانند سفید اور گچھے دار ہوتی ہے۔ خرگوش کی دو اقسام ہیں۔ انگلش میں خرگوش کو (Rabbit) اور ارنب کو (Hare) کہتے ہیں۔ ہماری بول چال میں ارنب (Hare) کا لفظ عام نہیں، تاہم لغت میں یہ لفظ موجود ہے۔ یہ بات مشہور ہے کہ خرگوش پالتو کو جب کہ ارنب جنگلی خرگوش کو کہتے ہیں۔

خرگوش پالتو بھی ہوتے ہیں اور جنگلی بھی۔ خرگوش کے کان اور پچھلی ٹانگیں ارنب کی نسبتا چھوٹی ہوتی ہیں۔ عام طور پر خرگوش بھٹ میں رہتے ہیں۔ مادہ خرگوش ایک وقت میں تین سے زائد بچے دیتی ہے۔ جب تک بچے پندرہ دن کے نہیں ہو جاتے، وہ پالنے میں پڑے رہتے ہیں اور وہیں انہیں غذا ملتی ہے۔ مادہ خرگوش سال میں کئی بار بچے جنتی ہے اور اس وجہ سے اس کی نسل تیزی سے فروغ پاتی ہے۔ بچے پیدائش کے وقت اندھے ہوتے ہیں اور جسم پر بال بھی نہیں ہوتے۔ اس کے برعکس ارنب (Hare) میں بچوں کی آنکھیں کھلی اور جسم پر بال ہوتے ہیں۔ یہ ابتداء ہی سے چست و چالاک ہوتے ہیں اور زمین پر گھونسلے نما گھر بنا کر رہتے ہیں۔ بنیادی طور پر خرگوش کا وطن شمالی افریقہ ہے۔ کہتے ہیں کہ کافی عرصہ پہلے کوئی باشندہ خرگوش کو یورپ لے آیا اور رفتہ رفتہ اُس کی نسل ساری دنیا میں پھیل گئی۔

خرگوش کا معدہ ایک خانے پر مشتمل ہے جب کہ گائے، بیل کے چار خانے ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے اس کا شمار جگالی کرنے والے جانوروں میں نہیں ہوتا۔

(عالیہ گیلائی، لاہور)



اسماعیل علیہ السلام کا ایک ہال بھی نہ کٹا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کی اس قربانی کو قبول کیا۔ اور مسلمانوں کے لیے اس سنت کو جاری کر دیا۔ مسلمان ہر سال اسلامی سال کے بارہویں مہینے ذوالحجہ کی دس تاریخ کو اس واقعے کی یاد میں عید الاضحیٰ مناتے ہیں اور جانوروں کی قربانی کرتے ہیں اور ان کا گوشت کھاتے ہیں۔ قربان کیے گئے جانوروں کے گوشت کو تین حصوں میں برابر تقسیم کیا جانا چاہیے۔ ایک حصہ غریبوں کے لیے، دوسرا حصہ رشتہ داروں کے لیے اور تیسرا حصہ اپنے لیے۔ اگر رشتہ دار آپ کے گھر آجائیں تو ان کے حصے کا گوشت انہیں پکا کر کھلایا جاسکتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ہے کہ اس روز اللہ تعالیٰ کو قربانی یعنی جانوروں کو ذبح کرنے سے زیادہ پسند اور کوئی عمل نہیں۔

جو جانور اللہ کی راہ میں ذبح کیا جائے۔ وہ ہر قسم کے جسمانی عیب سے پاک ہونا چاہیے۔

ایک مینڈھ یا ایک بکرا ایک فرد کی طرف سے قربان کیا جاسکتا ہے۔ جب کہ گائے اور اونٹ سات افراد کی طرف سے قربان کیے جاسکتے ہیں۔ دنبہ یا بھیڑ چھ ماہ کی ہونی چاہیے جب کہ بکرا یا بکری ایک سال کی مکمل ہو کر دوسرے سال میں داخل ہو۔ اسی طرح گائے یا بھیڑ دو سال کی مکمل ہو کر تیسرے سال میں داخل ہونی چاہیے۔ اونٹ اور اونٹنی کی عمریں پانچ سال مکمل ہو کر چھ سال میں داخل ہونی چاہیے۔ حدیث پاک میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر جانور کے ہر ہال پر اجر و ثواب عطا فرمائے گا۔ اور قیامت کے روز پل صراط سے گزرنے کے لیے ان جانوروں کو ذریعہ بنائے گا۔

حدیث پاک میں یہ بھی آتا ہے کہ جو شخص جانور ذبح کرنے کی طاقت رکھتا ہو اور وہ قربانی نہ کرے تو عید کے روز ہماری عید گاہ کے قریب بھی نہ آئے۔ یعنی عید کی یہ خوشی حقیقت میں اسی کو میسر آتی ہے جو حضرت ابراہیم کی سنت کی پیروی کرتا ہے۔

☆☆

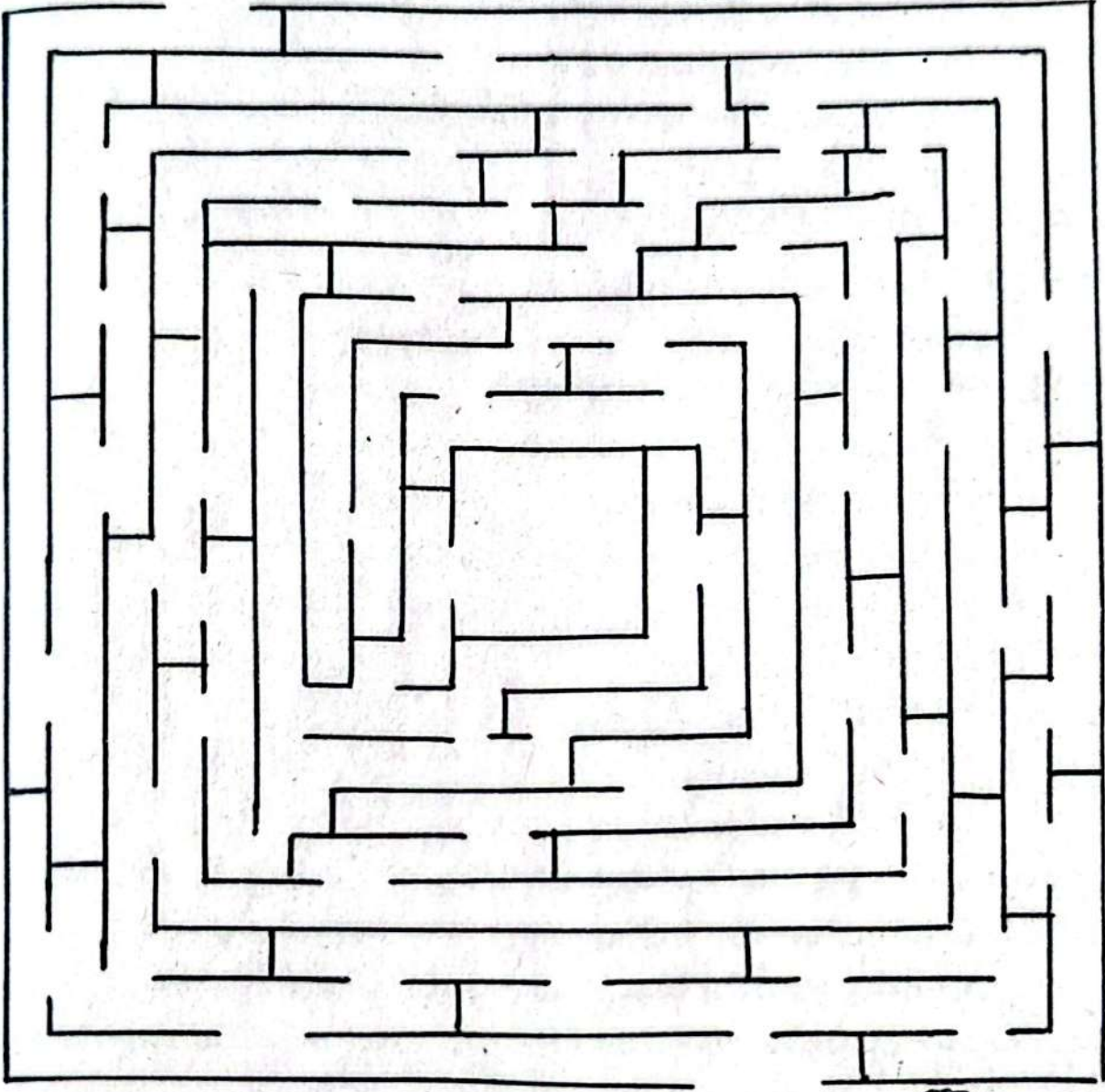
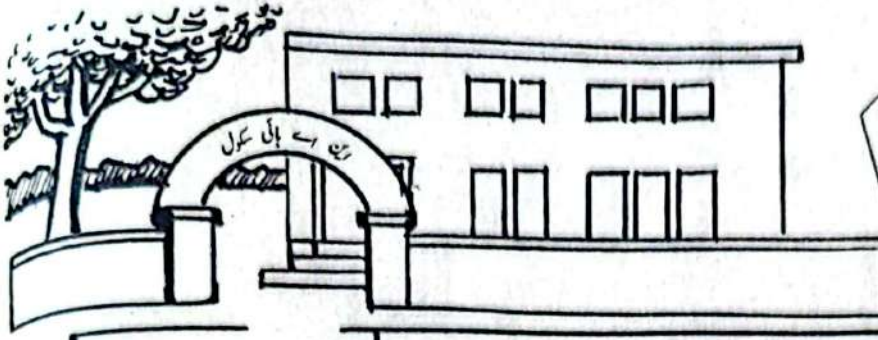
عید کا نام آتے ہی چہروں پر خوشی اور مسرت کے پھول کھل اٹھتے ہیں۔ کیوں کہ عید نام ہی خوشی کا ہے۔ عید الاضحیٰ کو عید قربان بھی کہا جاتا ہے۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب دیکھا کہ وہ اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی راہ میں قربان کر رہے ہیں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام اس وقت تقریباً تیرہ برس کے تھے۔ صبح جب وہ بیدار ہوئے تو انہوں نے یہ خواب اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو سنایا تو بیٹے نے عرض کی اے ابا جان آپ وہ کر دیجئے جس چیز کا اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے ان شاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے۔

چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں ذبح کرنے کے لیے میدان منیٰ میں تشریف لے گئے۔ راستے میں شیطان نے آپ کو تین بار بہکانے کی کوشش کی۔ حضرت ابراہیم نے تینوں بار اُسے سات سات کنکریاں ماریں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس سنت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حجاج کے لیے لازم قرار دے دیا گیا۔

حضرت ابراہیم نے اپنے بیٹے کو زمین پر لٹایا، بچے کے پاؤں باندھے اور اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اللہ کا نام لے کر بیٹے کے حلق پر چھری چلائی تو اسی وقت اللہ تعالیٰ نے جنت سے ایک دنبہ بھیجا جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں ذبح ہو گیا۔ حضرت

راستہ تلاش کریں



وقاص کو سکول سے دیر ہو رہی ہے۔
آپ سکول کا راستہ تلاش کرنے میں اس کی مدد کریں۔





ایک سبق تمہارے لیے

محمد یاسین یوسف (لاہور)

عزیز نے اسی شوخی سے جواب دیا: ”پہلے آپ میرے سوال کا جواب دیں پھر میں آپ کو ساری بات بتاؤں گا، امی ابو کا فون کیوں آیا تھا؟“

”وہ تمہارے بارے میں پوچھ رہے تھے کہ عزیز نے سکول سے آکر کھانا کھا لیا ہے یا نہیں۔“

”اچھا، اچھا آج تو میں نے بڑے مزے مزے کی چیزیں کھائی ہیں بھائی صاحب۔“ عزیز نے چٹخارہ بھرتے ہوئے کہا۔ ”مگر کہاں سے اور کس کی ہے یہ موٹر سائیکل؟“ مبین نے تلخ لہجہ میں پوچھا۔

”بتاتا ہوں آپ مجھ سے صرف چار سال بڑے ہیں یعنی میں بارہ سال کا اور آپ سولہ سال کے، تو اتنے تھوڑے عمر کے فرق کی وجہ سے آپ مجھ پر اتنا رعب مت جمائیے اور سنئے میرا ایک کلاس فیلو ہے عامر، آج وہ مجھے اپنے گھر لے گیا تھا، سچ بھائی! اس کا گھر ہمارے گھر جیسا بڑا ہے، ہمارے ابو کی طرح اس کے ابو بھی کوئی بڑے افسر لگتے ہیں۔ مگر بھائی صاحب کیا موبیس ہیں اس کے گھر میں، چھ سات تو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ہمارے ابو امی تو لان کی کیاریوں میں پھول کم اور ضرورت کی سبزیاں اگا اگا کر ملازموں کے گھروں میں بھجواتے رہتے ہیں اُدھر اُس کے گھر میں ہر وقت فوارے چل رہے ہیں، دن میں بہت سی بتیاں ایسے جل رہی تھیں جیسے اُن کا بل ہی نہیں آتا

مبین میاں آدھے گھنٹہ سے برآمدے میں پڑی کر سی پہ بیٹھے اپنے چھوٹے بھائی عزیز کا انتظار کر رہے تھے۔

”تجربہ ہے چھٹی ہوئے پورے دو گھنٹے ہو گئے ہیں اور عزیز ابھی تک نہیں آیا۔“ دل ہی دل میں یہ سوچ کے وہ الحفظ کا ورد کرنے لگے۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ گیٹ پر کسی نے ہارن بجایا۔ مالی بابا جو پودوں کو سنوارنے میں لگے تھے انہوں نے جلدی سے گیٹ کھولا۔ عزیز کی خوشی سے چچھاتی آواز مبین کے کانوں میں پڑی۔ وہ کہہ رہا تھا:

”دیکھا بھائی جان! میں کتنی اچھی موٹر سائیکل چلاتا ہوں۔“ اور یہ کہہ کر اُس نے اندھا دھندلان کے چکر کاٹنا شروع کر دیے۔ وہ اس وقت تک نہیں رکا جب تک مبین نے چیخ چیخ کر یہ نہیں کہا کہ عزیز رک جاؤ امی ابو کا فون آیا ہے تمہارے لیے۔ عزیز نے موٹر سائیکل ایک طرف کھڑی کر دی اور پوچھنے لگا کہ کیا بات ہے، ابھی کل ہی امی ابو نانی جان کی عیادت کو گئے ہیں کیا پوچھ رہے تھے؟ اور یہ کہتے کہتے اُس نے لان میں لگے سارے فوارے کھول دیے مبین پھر ایک دفعہ چیخ پڑا:

”عزیز! آج تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا، اس طرح پانی ضائع کرنے کا کیا مطلب ہے اور یہ موٹر سائیکل کس کی ہے اور تم اتنی دیر کہاں تھے؟“

ہو۔ میں نے پوچھا تھا کہ یار ایسے تو پانی اور بجلی کا بل بہت زیادہ آتا ہو گا تو وہ ہنس کر کہنے لگا ہمارے ہاں گیس کے چولہے بھی کم ہی بند کیے جاتے ہیں، ہمیں کون سا بل دینا پڑتا ہے۔ اسے سی ہر کمرے میں چل رہا تھا چاہے وہاں کوئی ہو یا نہ ہو، میں نے کہا مگر ہمارے ہاں تو ایسا نہیں ہے میرے ابو بھی تمہارے ابا جیسے بڑے افسر ہیں مگر نہ ہمارے ہاں اتنی گاڑیاں ہیں نہ پانی، بجلی اور گیس کو بلا ضرورت استعمال کر سکتے ہیں اور نہ ہی نوکروں کی فوج ہے۔ بل تو ہمیں بھی نہیں آتا مگر ہم پھر بھی کھلے ہاتھ سے بلا ضرورت بجلی، پانی اور گیس کو استعمال نہیں کر سکتے، ہمارے ابو بے حد ناراض ہوتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ یونہی دولت اور وسائل کو بے دردی سے خرچ کرنے سے ایک دن ہم ایسے گھمبیر مسائل میں گھیر جائیں گے جن سے نکلنا ناممکن ہو جائے گا انہوں نے تو ہم دونوں بھائیوں کو سائیکلیں لے دی ہیں سکول آنے جانے کے لیے، وہ کہتے ہیں اس طرح صحت بھی اچھی رہتی ہے اور ملکی توانائی کی بچت بھی ہوتی ہے۔ ابا کا بس چلے تو وہ وائس چانسلر ہوتے ہوئے بھی یونیورسٹی سائنیکل ہی پر جائیں مگر وقت کی بچت بھی ان کی نظر میں قومی سرمائے کی بچت ہے، اس لیے وہ کار کا استعمال کرتے ہیں۔ بھائی آپ یقین کریں میری باتوں پر وہ دیر تک ہنستا رہا پھر کہنے لگا چلو آج تم ہمارے مالی کی موٹر سائیکل پر گھر جاؤ تم نے ایک ہفتہ پڑھائی میں جس طرح میری مدد کی اور خاص طور سے حساب جیسا مشکل مضمون میرے لئے آسان کر دیا اس کے لیے یہ انعام کم ہے اور پھر اُس نے مجھے ایک بڑے ہوٹل میں کھانا بھی کھلایا بس اسی وجہ سے دیر ہو گئی ہے۔“

عزیز نے جھوٹی اور مانگی خوشی کے جوش میں اس بات پر بالکل دھیان نہیں دیا کہ مبین کا چہرہ غصے سے کس قدر تھم رہا ہے اور وہ بھائی کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ ابھی مبین ایک زور دار طمانچہ عزیز کے گال پر جڑنے ہی والا تھا کہ گیٹ کی تھننی بجنے لگی۔ مالی بابا نے دروازہ کھولا اور ایک پولیس انسپکٹر اور دو سپاہیوں کو دیکھ کر مبین اور عزیز پھرتی سے گیٹ پر پہنچ گئے۔ انسپکٹر نے حیرانی کے ساتھ نیم پلیٹ کی طرف اشارہ

کرتے ہوئے کہا: ”یہ تو ہمارے استاد محترم یونیورسٹی کے وائس چانسلر صاحب کی رہائش گاہ ہے، کیا وہ تشریف رکھتے ہیں؟“

مبین نے کہا: ”نہیں وہ کہیں گئے ہوئے ہیں۔ میں اور یہ میرا چھوٹا بھائی عزیز گھر پر ہیں، مگر آپ نے یہاں آنے کی زحمت کیوں کی ہے؟“

انسپکٹر نے کہا: ”ایک آدمی کی موٹر سائیکل چند روز پہلے چرائی گئی تھی اس کے بارے میں پتہ بھی چلا تھا کہ وہ شہر کے ایک بہت اثر شخصیت کے ملازم نے اٹھائی ہے، مگر اس پر ہاتھ نہ پڑ سکا، آج اطلاع ملی کہ اس روڈ پر ایک لڑکا وہی موٹر سائیکل لے جا رہا تھا۔ میں ادھر سے گزر رہا تھا کہ میری نظر استاد محترم کے گیٹ پہ لگی نام کی تھننی پر پڑی، سو میں نے سوچا سلام عرض کرتا چلوں، بیٹا میرا نام ہدایت اللہ ہے، میرا سلام اپنے ابو سے عرض کر دینا۔“

یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلے گئے۔ اب جو پلیٹ کے مبین نے عزیز کی طرف دیکھا تو عزیز کا یہ حال کہ کانٹو تو لبو نہیں بدن میں، خوف کے مارے اُس کا چہرہ زرد تھا اور وہ زار و تظار رو رہا تھا۔ مبین نے بھائی کو گلے لگایا اور کہنے لگا:

”بس اب چپ ہو جاؤ میرے خیال میں زندگی بھر کے لیے یہ سبق تمہارے لیے کافی ہے۔ یاد رکھو ملک و قوم اور لوگوں کی چیزوں کو اپنا مال سمجھے والے آخر ایک دن پکڑے جاتے ہیں نیز یہ کہ محض ظاہری شان و شوکت سے متاثر ہو کر لوگوں اور دوستوں پر بھروسہ کر لینا ہمیشہ نقصان کا باعث بنتا ہے، والدین کی طرف سے لگائی جانے والی پابندیاں بچوں کی بھلائی کا سبب بنتی ہیں اور انہیں خوش دلی سے قبول کرنا چاہیے۔ بھلا سوچو کہ اگر موٹر سائیکل سے تم کوئی حادثہ کر بیٹھتے تو نہ جانے کیا ہوتا، میں ابو کو فون کر کے تمام صورت حال انہیں بتاتا ہوں تا کہ وہ آکر جلدی سے موٹر سائیکل کا مناسب حل تلاش کریں۔“

---☆☆---

معلومات عامہ



غارت بالکل نہیں ہے۔

(حسنات فاطمہ، راول پنڈی)

☆ انسان کے مرنے کے بعد اُس کا دماغ 2 سے 4 گھنٹے تک کام کرتا ہے۔

☆ ڈاکٹار نائٹ کے موجد کا نام الفریڈ نوبل ہے۔

☆ سب سے پہلے کلوروفارم سر جیمس سمن نے استعمال کی۔

☆ پیدائش کے وقت بچے کی نبض کی رفتار 135 دھڑکن فی منٹ ہوتی ہے۔

☆ قوتِ سماعت ناپنے کے لئے آڈیومیٹر آلہ استعمال کرتے ہیں۔

(محمد جعفر، گروٹ)

☆ زمین پر سونے کی گہری ترین کان جنوبی افریقہ میں ہے اور یہ 2 میل 443 فٹ گہری ہے۔

☆ مگرچہ ایک ایسا جاندار ہے جس کی زبان نہیں ہوتی۔

☆ کویت دُنیا کا واحد ملک ہے جہاں کوئی دریا نہیں ہے۔

☆ دُنیا میں سب سے زیادہ پہاڑ سوئٹزر لینڈ میں ہیں۔

(محمد بلال سانول، خوشاب)

☆ گنبدوں کا شہر استنبول کو کہا جاتا ہے۔

☆ بازاروں کا شہر قاہرہ کو کہا جاتا ہے۔

☆ ہاتھی دُنیا کا واحد ملک ہے جو اچھل نہیں سکتا۔

☆ بندر وہ واحد جانور ہے جو رنگوں میں تمیز کر سکتا ہے۔

☆ دُنیا کی سب سے خطرناک چوٹی ٹانگا پر بت ہے۔

☆ فلک بوس عمارتوں کا شہر نیویارک کو کہا جاتا ہے۔

☆ دُنیا میں سب سے زیادہ اگنے والی سبزی آلو ہے۔

☆ پاکستان میں سب سے بڑی کرکٹ ٹرائی کا نام قائد اعظم ٹرائی ہے۔

☆ پاکستان کا سب سے بڑا ریڈیو اسٹیشن اسلام آباد میں ہے۔

☆ مینارِ پاکستان پر علامہ اقبال کی نظم ”اسرارِ خودی“ کے اشعار

(محمد مبین احمد، ساہی وال)

کندہ ہیں۔

☆ ہسودیم ایک ایسی دھات ہے جسے پانی میں ڈالیں تو جل اٹھتی ہے۔

☆ ہندو آسمان پر اڑتے ہوئے زمین میں پانی کی گہرائی اور پانی کے بیٹھے یا کڑوا ہونے کا اندازہ لگا لیتا ہے۔

☆ آدم خور درخت افریقہ میں پائے جاتے ہیں اور ان درختوں پر چڑھیں گھنے بارش ہوتی رہتی ہے۔ اور ان درختوں کا چھلکا

سوغندے انسان بے ہوش ہو جاتا ہے۔

(مصباح فاروق، شاہ پور)

☆ مسلم دُنیا کا سب سے زیادہ جزیروں والا ملک انڈونیشیا ہے۔

☆ تقریباً 1919000 مربع کلومیٹر کے رقبوں پر مشتمل مکمل جزیروں والا ملک ہے۔

☆ مسلم دُنیا کا سب سے چھوٹا ملک مالدیپ ہے۔ جس کا رقبہ

تقریباً 298 مربع کلومیٹر ہے۔

☆ رقبے کے لحاظ سے مسلم دُنیا کا سب سے بڑا ملک قازقستان ہے۔

☆ مسلم دُنیا کی پہلی ایٹمی طاقت پاکستان ہے۔

☆ مسلم دُنیا میں پٹ سن 85%، پٹرول 80%، پام آئل

75%، ربڑ 70%، قدرتی گیس 52% اور یورینیم 40% پیدا

ہوتی ہے۔

☆ سعودی عرب کی 100 فیصد آبادی مسلم ہے۔

☆ براعظم افریقہ میں سب سے بڑا مسلم ملک سوڈان ہے۔

☆ مسلم دُنیا کے ملک لیبیا کا مقام العزیز یہ دُنیا کا سب سے گرم

ترین مقام ہے۔

☆ یورپ میں تین اسلامی ملک ہیں جن میں بوسنیا، البانیہ اور

کوسو شامل ہیں۔

☆ دُنیا کا سب سے بڑا صحرا صحارا افریقہ کے مسلم ممالک

سوڈان، لیبیا، الجیریا، چاڈ، مالی، نائیجیریا اور موریتانیہ میں ہے۔

☆ مسلم دُنیا میں سب سے زیادہ مسجدیں ڈھاکہ (بنگلہ دیش)

میں ہیں۔

☆ دُنیا کا سب سے زیادہ امن والا شہر مکہ ہے۔ جہاں قتل

ٹکٹ شائع کیا گیا تھا۔ دو اکتوبر 1961ء کو محکمہ ڈاک نے چائلڈ ویلفیئر ویک (Child Welfare week) پہ خصوصی ٹکٹ شائع کیے تھے۔ 2009ء تک دنیا بھر میں 400000 طرح کے ڈاک ٹکٹ جاری ہو چکے ہیں۔ ڈاک ٹکٹ جمع کرنا ایک مشغلہ ہے جسے ”PHILATELY“ کہا جاتا ہے۔

عقاب (Falcon)

مصور پاکستان حضرت ڈاکٹر محمد علامہ اقبالؒ مسلمان نوجوانوں کو عقاب کی مانند دیکھنا چاہتے تھے۔ عقاب کا سائنسی نام ”FLACO“ ہے۔ اس کی 50 کے لگ بھگ اقسام پائی جاتی ہیں۔ یہ ایک بڑا، مضبوط اور خوب صورت پرندہ ہے۔ اپنی طاقت، بھاری گردن، بڑے پروں اور تیز نگاہ کے باعث عقاب کا کوئی ثانی نہیں۔ اس کی نظر انسانی نظر سے 2.6 گنا زیادہ تیز ہوتی ہے۔ اس کے نوکیلے پنجے، لمبا انگوٹھا اور مڑے ہوئے ناخن اس کو شکار کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ عقاب اپنی جسامت



میں 6 انچ سے لے کر 25 انچ تک ہو سکتا ہے۔ جب کہ اس کا وزن 1.8 کلو گرام تک ہوتا ہے۔ ان کے پروں کا رنگ مختلف ہوتا ہے۔ اس کا انحصار ان کی اقسام پر ہے۔ مادہ عقاب وزنی ہوتی ہے۔ عقاب کی اوسط عمر 20 سال ہے۔ عقاب کے اڑنے کی اوسط رفتار 290 کلو میٹر فی گھنٹہ ہے۔

کپاس (Cotton)

انسانی جسم کو ڈھانپنے کے لیے کپڑا استعمال ہوتا ہے۔ کپڑا جن ریشوں سے تیار کیا جاتا ہے وہ کپاس کے پودے سے حاصل ہوتے ہیں۔ کپاس کا سائنسی نام ”Gossypium“



ڈاک ٹکٹ (Post Stamps)

ایس ایم ایس اور ای میل کی سہولیات آجانے کے باوجود خطوط ارسال کرنے اور ان کا جواب دینے کا اپنا ہی مزا و اہمیت ہے۔ خط کا سنتے ہی ڈاک ٹکٹ کا تصور آتا ہے۔ 1840ء سے قبل چاندی، لکڑی اور کارک کی مہریں ثبت کر کے ٹکٹ کا کام لیا جاتا تھا۔ ڈاک ٹکٹ ایک خاص چکنے والا کاغذ ہے جو مختلف مالیت کا حامل ہوتا ہے۔ پہلا باضابطہ ڈاک ٹکٹ برطانیہ سے یکم



مئی 1840ء کو جاری ہوا۔ اس کا نام ”Penny Black“ رکھا گیا۔ جس پر ملکہ وکٹوریہ کی تصویر چھپی تھی۔ یہ ہموار ٹکٹ تھی۔

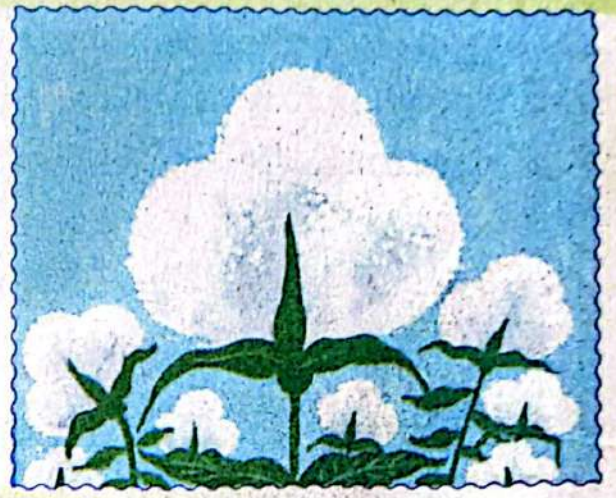
1854ء میں ٹکٹوں پہ دندانے (Perforations) بتائے جانے لگے۔ پاکستان کی 64 سالہ تاریخ میں 1100 مختلف ٹکٹ شائع ہو چکے ہیں۔ پاکستان کا شمار خوب صورت ڈاک ٹکٹ شائع کرنے والے ممالک میں ہوتا ہے۔ پاکستانی ڈاک ٹکٹ پہ لفظ ”PAKISTAN“ پہلی بار یکم اکتوبر 1947ء کو شائع ہوا۔ گیارہ ستمبر 1949ء کو قائد اعظم کی برسی کے موقع پر خصوصی

میں کھلاڑی ایک مخصوص وزن کی دھاتی تھالی اپنی پوری قوت کے ساتھ پھینکتا ہے اور سب سے دُور تھالی پھینکنے والے کو انعام ملتا ہے۔ یہ قدیم کھیل ہے جو 500 قبل مسیح میں بھی کھیلا جاتا تھا۔ البتہ جدید کھیلوں کی تاریخ میں 1896ء کے اولمپکس میں اس کو پہلی بار شامل کیا گیا تھا۔ جب کہ خواتین کو 1928ء میں اولمپکس کے دوران پہلی بار اس کھیل میں شامل کیا گیا تھا۔ اس کھیل میں کھلاڑی 2 کلو گرام کے لگ بھگ وزنی تھالی پھینکتا ہے۔ جس کا قطر 220 ملی میٹر ہوتا ہے۔ جب کہ خواتین کے لیے اس کا وزن 1 کلو گرام اور ڈایا میٹر 181 ملی میٹر ہوتا ہے۔ کھلاڑی کنکریٹ کی 2.5 میٹر قطر کی سطح سے تھالی ایک جانب



پھینکتا ہے جہاں 34.92 ڈگری پر لائن لگی ہوتی ہے۔ جس کھلاڑی کی تھالی گرتی ہے اُس کی پیمائش کر لی جاتی ہے۔ پاکستان کے سب سے عمدہ تھالی پھینکنے والے کھلاڑی کا نام بشارت علی ہے۔ جن کا تعلق ضلع انک سے ہے۔ جنہوں نے 6 فروری 2010ء میں ساؤتھ ایشین گیمز (منعقدہ بنگلہ دیش) میں بھارت، سری لنکا اور دیگر ممالک کے کھلاڑیوں کو شکست دے کر پاکستان کے لیے سونے کا تمغہ حاصل کیا۔ اس کھیل کے قوانین 1907ء میں وضع کیے گئے تھے جب کہ 1954ء سے کنکریٹ کا دائرہ تھالی پھینکنے کے لیے استعمال ہو رہا ہے۔ انسانی تاریخ کے مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں لوگ 2 سے 6 کلو گرام اور 21 سے 34 سینٹی میٹر قطر کے پتھر پھینک کر اس کھیل سے محظوظ ہوا کرتے تھے۔

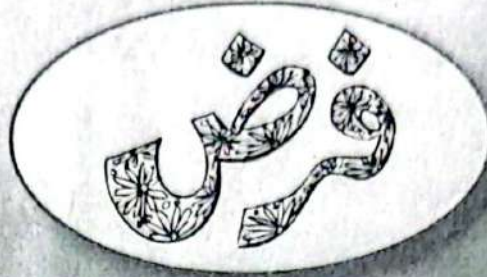
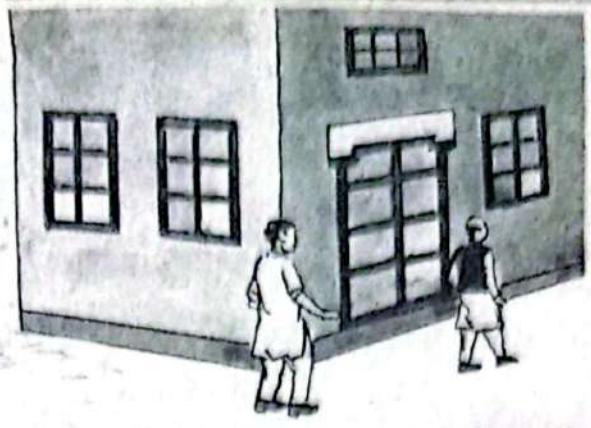
”Hirsutum“ ہے۔ جس کا خاندان ”Malvaceae“ ہے۔ یہ درمیانے سے قد کا پودا (Shrub) ہے۔ جو امریکہ، پاکستان، بھارت اور افریقہ کے ممالک میں تجارتی بنیادوں پر کاشت ہوتا ہے۔ انگریزی میں لفظ کاٹن (Cotton) درحقیقت عربی زبان کے لفظ ”Al-Qutin“ سے لیا گیا ہے۔ اس پودے کی کاشت 7000 سے 8000 سال قبل شروع ہوئی تھی۔ 1738ء میں لہوس پال (Lewis Paul) اور جان ویٹ (John Wyatt) نامی برطانوی افراد نے پہلی مرتبہ کپڑا بننے والی مشین (Spinning Machine) رجسٹر کروائی۔ دیکھتے دیکھتے برطانیہ کا علاقہ مانچسٹر کپڑے کی صنعت کے حوالے سے عالمگیر



شہرت حاصل کر گیا۔ کپاس کو زیادہ روشنی (Sun light) والے علاقے پسند ہیں۔ جہاں سالانہ بارش 600 سے 1200 ملی میٹر تک ہو۔ 2009ء میں سب سے زیادہ کپاس پیدا کرنے کا اعزاز چین کو حاصل ہوا۔ جس نے 34 ملین گانٹھیں پیدا کیں۔ مارچ 2006ء میں امریکہ میں Memphis کے مقام پر کپاس عجائب گھر (Cotton Museum) بھی قائم کیا گیا ہے۔ جہاں کپاس کی اقسام اور کپڑے کی تیاری میں استعمال ہونے والی مشینری کو تاریخ کے اعتبار سے رکھا گیا ہے۔ پاکستان کا شہر فیصل آباد کپڑے کی تیاری کے حوالے سے ایشیاء کا مانچسٹر کہلاتا ہے۔

تھالی پھینکنا (Discus Throw)

ڈسکس تھرو یعنی تھالی پھینکنا بڑا دل چپ کھیل ہے۔ جس



شہری بی غم (سلاقی آباد)

بدو کے بھہو کے اٹھتے ہیں اور جانوروں کے فضلہ کا ذخیرہ بن کر پیدا کرنے کا باعث بن چکا ہے، مگر ابو ہمیشہ اسے یہ کہہ کر چپ کروا دیتے کہ شکر کرو چھکو پہلوان سے سستا دودھ مل جاتا ہے۔

”مگر وہ دودھ بھی تو پانی والا دیتے ہیں۔“ عادل نے کہا۔
”تو مجھے لادو خالص اور سستا دودھ کہیں سے، آج اس دور میں، شکر ادا نہیں کرتے کہ اتنی مہنگائی کے زمانے میں چھکو بے چارہ سستا دودھ فراہم کر دیتا ہے اور تم لوگوں کو باتیں آتی ہیں..... جاؤ جا کے پڑھو..... یہ باتیں تمہارے سوچنے کی نہیں ہیں۔“

یہ سن کر چار عادل سر جھکائے چھوٹے بھائی کو ساتھ لیے کتاب کھول کے بیٹھ تو گیا، مگر اُس کی سوچ کی سوئی ایک ہی نقطے پر انگی ہوئی تھی۔

پندرہ سالہ عادل میٹرک کا طالب علم تھا اور ساری سوچ بوجھ رکھتا تھا۔ جب سے گورنمنٹ نے اعلان کیا تھا اور میونسپل کمیٹی نے سختی شروع کی تھی وہ قانون کی مدد کرنا چاہتا تھا، وہ جانتا تھا کہ اگر ہر شخص کے اندر احساس ذمہ داری پیدا ہو جائے تو ہمارے ملک کو جو مسائل درپیش ہیں

میونسپل کمیٹی کے ارکان بالا کا آرڈر آئے ایک مہینہ ہو چکا تھا کہ بھینسوں کے باڑے اور کباڑ خانے شہر کی حدود سے باہر بنائے جائیں اور حفظانِ صحت کے اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے شہر کو صاف رکھا جائے۔ جہاں کہیں ایسی شکایت ملے تو فوراً میونسپل کمیٹی کے شکایات سیل کو اطلاع دی جائے۔ ایسا کرنے سے شہر کے کئی حصوں سے تو باڑے اور کباڑ خانے ختم کر کے شہر سے باہر منتقل کر دیے گئے، مگر چھکو پہلوان کا باڑہ اب بھی گلی کی نکل میں جوں کا توں موجود تھا، جہاں سے پورا محلہ دودھ لیا کرتا تھا چونکہ چھکو پہلوان کی جان پہچان میونسپل کمیٹی کے عملے سے تھی وہ اُن کو تھوڑے بہت پیسے دے دلا کر ان کا منہ بند کیے رکھتا تھا اور رہی بات شکایت کی تو محلے والوں کو با آسانی اتنے قریب سے دودھ مل جاتا تھا وہ کیوں دُور جانے کی مصیبت مول لیتے، مگر عادل اس بارے میں بہت پریشان تھا۔ گلی میں باڑے کے ساتھ دوسرا گھر عادل کا ہی تھا۔ جہاں وہ اپنے چھوٹے بھائی شاہنزل اور ماں باپ کے ساتھ رہتا تھا۔

عادل اپنے ابو سے بارہا کہہ چکا تھا کہ چھکو چچا سے کہیں کہ وہ اپنا باڑہ شہر سے باہر لے جائیں کیوں کہ اُن کے باڑے سے

کلیاں

☆ بے شک جتنی دیر مرضی سوچو لیکن سوچنے کے بعد تمہارا فیصلہ اٹل ہونا چاہیے۔

☆ دوست کو اُس مرغابی کی طرح نہیں ہونا چاہیے جو تالاب کے خشک ہونے پر کسی اور تالاب کا رخ کرتی ہے بلکہ کنول کے اس پھول کی طرح ہونا چاہیے جو پانی خشک ہو جانے پر بھی اُسی میں مرجھا جائے۔

☆ دوست کی دوستی پر اندھا اعتماد مت کرو کیوں کہ اُس کا وار دشمن سے بھی کاری ہوتا ہے۔

(ربیعہ رشید، نکانہ صاحب)

اُس کا دوست فرحان میونسپل کمیٹی کے سربراہ محمد سردار کا بیٹا تھا۔ آج اُس نے فرحان کے ساتھ مل کر سکول میں چچا چھکو پہلوان کے خلاف درخواست لکھی تھی اور اب وہ فرحان کے ساتھ اُس کے ابو کے دفتر میں خود درخواست دینا چاہتا تھا۔

وہ فرحان کو لیے میونسپل کمیٹی کے آفس جا پہنچا تھا اور محمد سردار کے سامنے بیٹھا انہیں سب کچھ بتا رہا تھا۔
”واقعی یہ تو بہت اہم معاملہ ہے، لیکن بیٹا آپ نے پہلے اطلاع کیوں نہیں کی حالانکہ شکایت میل کا نمبر آپ کے پاس ہے۔“
”میرے ابو! اور پھر اُس نے سر جھکا لیا۔

”میں سمجھ گیا، مگر میں خوش ہوں کہ آپ نے اپنا فرض ادا کر کے اچھے اور وطن کے ساتھ مخلص شہری ہونے کا ثبوت دیا۔“

محمد سردار انہیں تسلی دیتے ہوئے رخصت کیا اور اُسی شام اپنی ٹیم کے ساتھ جا کر چچا چھکو کے باڑے میں چھاپہ مارا۔ کمیٹی نے ساری بھینسیں اور گائیں اپنی تحویل میں لے لیں اور چھکو پہلوان کو گرفتار کر لیا گیا۔

عادل کے ابو پریشان حال کھڑے سارا ماجرا دیکھ رہے تھے جب کہ عادل اپنے ساتھ کھڑے شاہزل کو تندرست اور مسکراتا ہوا دیکھ کر خوش ہو گیا تھا۔

---☆☆---

وہ با آسانی حل ہو سکتے ہیں مگر ابو کی ڈانٹ سے وہ سہم سا گیا تھا۔

عادل کے چھوٹے بھائی شاہزل کو بخار ہوئے چوتھا روز تھا اور بخار تھا کہ اترنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ عادل کے ابو شاہزل کو روزانہ کسی کیسٹ کے پاس لے جاتے اور ہلکی پھلکی دوا دلا دیتے مگر وقت گزرنے کے ساتھ اُس کا بخار بڑھتا چلا گیا۔

ایک روز ابو دوسرے شہر گئے ہوئے تھے تو امی نے عادل سے کہا:

”شاہزل کا بخار بہت بڑھ گیا ہے بیٹا تم اسے کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔“

عادل نے اثبات میں سر ہلایا اور بھائی کو ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔

”اسے تو ملیریا ہے اور وہ بھی بگڑ گیا ہے۔“ ڈاکٹر نے اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد عادل کو بتایا

”اچھا کیا جو اسے جلدی میرے پاس لے آئے ورنہ معاملہ زیادہ خراب ہو سکتا تھا۔“

ڈاکٹر نے پرچی پر ادویات لکھیں اور عادل کو چند ہدایات دیں۔ عادل نے ادویات لیں اور بھائی کو لیے گھر آگیا۔ ماں کے پوچھنے پر اُس نے ساری بات بتادی۔

وہ جانتا تھا کہ ملیریا کی اصل وجہ۔ چچا چھکو کا باڑہ ہے۔ اُس رات عادل نے سوچا اور کچھ ٹھان کر آنکھیں موند لیں۔

اگلے روز سکول سے آتے ہی اُس نے کھانا کھایا اور اپنے بیگ سے سفید رنگ کا ایک کاغذ نکالا۔

”بیٹا! کہاں جا رہے ہو..... تھوڑا آرام کر لو۔“ عادل کی ماں جو شاہزل کو دوا کھلا رہی تھیں اُسے دروازے کے پاس جاتا دیکھ کر بولیں۔

”امی! مجھے فرحان سے کچھ کام ہے..... بس تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔“

”اپنے ابو کے گھر آنے سے پہلے لوٹ آنا۔“ امی جان نے کہا۔

گگو کی گڑیا

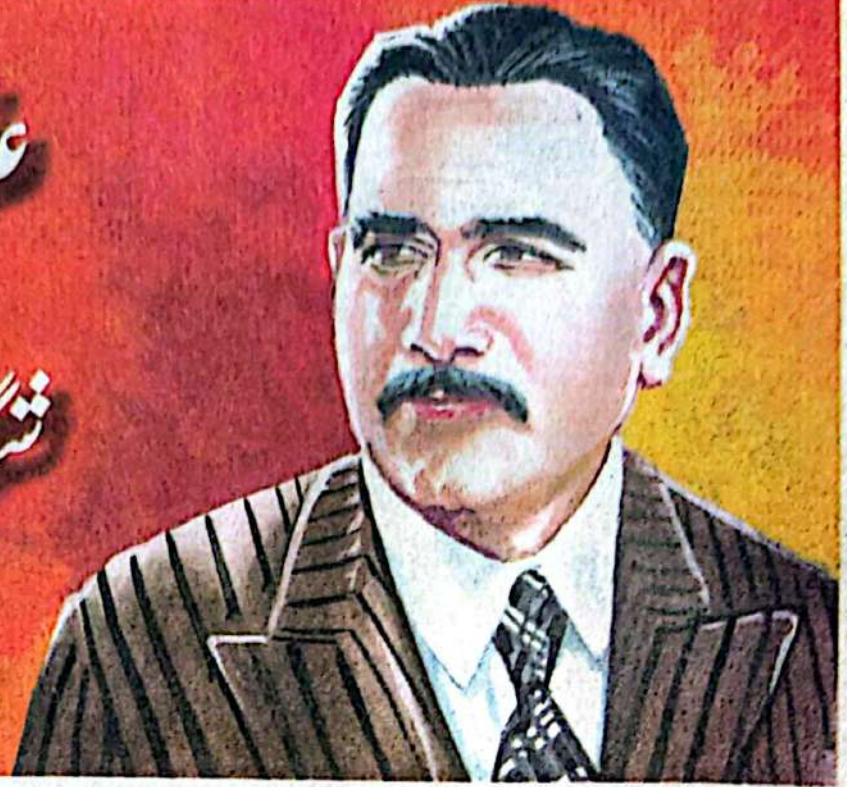


گگو کی نیلی آنکھوں والی گڑیا
 نائی نائی جیسے آفت کی پڑیا
 اُجلے اُجلے کپڑے پہنے رکھتی ہے
 جب بھی دیکھو وہ جھولی میں بیٹھی ہے
 فر فر بولے، آنکھیں جھپکے، روئے بھی
 چھونے سے وہ اپنا سبق سنائے بھی
 عینی نے پوچھا کہ گڑیا کیسی ہے
 گگو بوبی بالکل میرے جیسی ہے
 میری گڑیا پورا برگر کھاتی ہے
 میرے کان میں ملی نغمے گاتی ہے
 ماما ! دیکھیں رنگ سنہرا گڑیا کا
 کتنا بھولا بھالا چہرا گڑیا کا
 پاپا ! یہ بھی کل اسکول میں جائے گی
 ثانی، بسکٹ، آئس کریم بھی کھائے گی
 پڑھتے پڑھتے گڑیا تھک بھی جاتی ہے
 سر رکھ کر پھر میری گود میں سوتی ہے
 سیل پرانے ہو جاتے ہیں پاپا جی !
 اور کھلونے رُک جاتے ہیں پاپا جی !

ناصر ملک (لیہ)

علامہ اقبال کی شگفتہ مزاجی

رانا محمد شاہد (پورے والا)



”ت“ سے لکھا۔ استاد جب بچوں کی املا دیکھنے لگے تو اقبال کی املا دیکھتے ہوئے لفظ ”غلط“ پر رک گئے اور بولے:

”اقبال میاں! یہ لفظ آپ نے غلط لکھا ہے۔“

اقبال نے کہا: ”ماسٹر صاحب! آپ نے یہ لفظ پڑھا ہی غلط تھا، سو میں نے غلط لکھ دیا۔“

استاد صاحب حیران ہوئے، کہنے لگے:

”میں نے یہ لفظ غلط پڑھا تھا، کیا کہہ رہے ہو تم؟ میں نے یہ لفظ غلط نہیں پڑھا تھا۔“

اقبال نے پوچھا: ”اچھا تو پھر یہ بتائے کہ آپ نے کیا لفظ پڑھا تھا؟“

”غلت“ استاد صاحب نے کہا۔

اس پر اقبال فوراً بولے: ”تو پھر ٹھیک ہے نا۔ آپ نے غلت پڑھا اور میں نے غلت لکھ دیا۔ اس میں میری تو کوئی غلطی نہیں۔ آپ نے ٹھیک پڑھا ہوتا تو میں بھی ٹھیک لکھتا۔“ کسن اقبال کے اس جواب پر استاد صاحب مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

ایک دفعہ کسی کالج کے چند طلباء نے اقبال کو اپنے کسی

یہ بات تو ہم سب جانتے ہیں کہ علامہ اقبال ہمارے قومی شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مفکر اور فلسفی بھی تھے، لیکن شاید یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ علامہ اقبال بہت شگفتہ مزاج، حاضر جواب اور بذلہ سخ بھی تھے۔ اکثر اوقات ایسا لطیف مزاح یا طنز کرتے کہ محفل کشت زعفران بن جاتی۔

علامہ اقبال بچپن ہی سے بہت ذہین و فطین اور حاضر جواب تھے۔ یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ ایک دفعہ آپ کو سکول پہنچنے میں دیر ہو گئی تو استاد نے کلاس روم میں کھڑے کر کے پوچھا:

”اقبال تم دیر سے کیوں آئے ہو؟“

کم عمر اقبال نے برجستہ کہا:

”جناب اقبال (خوشی بختی) ہمیشہ دیر سے ہی آیا کرتا ہے۔“ اس ذہانت پر آپ کو اپنے استاد سے شاباش ملی۔

علامہ اقبال کے سکول کا ایک واقعہ کچھ یوں ہے کہ ایک دفعہ اردو کے استاد املا لکھوا رہے تھے۔ املا میں کسن اقبال کوئی غلطی نہیں کرتے تھے لیکن جب استاد نے ایک لفظ ”غلط“ لکھوایا تو اقبال کو شرارت سو جھی۔ انہوں نے لفظ ”غلط“ کو

اور آرام دینے میں کام یاب ہو سکا تو پھر یقیناً میں نہ صرف ہندوؤں اور سکھوں بلکہ دنیا بھر کے انسانوں کے لئے لکھوں گا۔“ علامہ اقبال کا یہ فلسفیانہ اور مدلل جواب سن کر تمام سامعین لاجواب ہو گئے۔

علامہ صاحب کو عمر کے آخری حصے میں شوگر کا مرض لاحق ہو گیا تھا، جس کے باعث حکیم صاحب نے انہیں آم کھانے سے منع کر دیا تھا۔ چون کہ علامہ کو آم بہت پسند تھے، اس لیے بحث کے بعد حکیم صاحب نے ایک آم کھانے کی اجازت دے دی، لیکن ساتھ ہی زور دے کر کہا:

”صرف ایک آم روزانہ کھانے کی اجازت ہے۔ اس سے زیادہ ہر گز نہیں۔“

کچھ دنوں بعد حکیم صاحب دوبارہ معائنہ کرنے کے لئے آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ علامہ صاحب کے سامنے طشتری میں ایک بڑا سا آم رکھا ہے۔ جو کئی آموں کے مساوی ہے اور علامہ صاحب بڑے مزے سے چھری سے کاٹ کاٹ کر آم نوش فرما رہے ہیں۔ حکیم صاحب نے آم کی طرف اشارہ کر کے غصے سے پوچھا:

”کیوں جناب! یہ سب کیا ہے؟“

علامہ صاحب معصومیت سے بولے: ”یہ صرف ایک آم ہے۔“ فقیر سید وحید الدین اپنی کتاب ”روزگارِ فقیر“ میں علامہ اقبال کے حوالے سے ایک واقعہ لکھتے ہیں۔

”میرے ایک قریبی رشتے دار سید واجد علی کو کتے پالنے کا بہت شوق تھا۔ ایک دفعہ میں اُن کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کر ڈاکٹر صاحب سے ملنے گیا۔ موٹر میں اُن کے کتے بھی تھے۔ ہم لوگ ڈاکٹر صاحب کے پاس جا بیٹھے اور کتوں کو موٹر ہی میں چھوڑ دیا۔ تھوڑی دیر میں ڈاکٹر صاحب کی ننھی بچی منیرہ بھاگتی ہوئی اور کہنے لگی:

”ابا جان! موٹر میں کتے آئے ہیں۔“

ڈاکٹر صاحب نے ہماری طرف اشارہ کر کے کہا:

”نہیں بیٹا یہ تو آدمی ہیں۔“

☆☆☆

ادبی جلسے میں شرکت کی دعوت دی۔ علامہ نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کے لئے تشریف لے گئے۔ دورانِ جلسہ چند شوخ قسم کے لڑکوں نے علامہ کو چھیڑنے کی غرض سے کہا:

”علامہ صاحب! ایک مصرعہ ہے اگر آپ دوسرا مصرعہ موزوں کر دیں تو ہم جائیں۔“

علامہ مسکرائے اور کہا: ”اچھا مصرعہ بتاؤ۔“

ایک طالب علم نے مصرعہ سنایا۔

”دشت اشکوں سے بھریں، آہ سے سوکھیں دریا۔“

علامہ اقبال نے بلا توقف شعریوں مکمل کیا۔

دشت اشکوں سے بھریں، آہ سے سوکھیں دریا

مچھلیاں دشت میں پیدا ہوں، ہرن پانی میں

یہ شعر سن کر سب حاضرین لاجواب ہو گئے۔

ایک دفعہ ہندو اور سکھ طلباء کا ایک خصوصی وفد علامہ اقبال سے ملنے آیا۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس دوران طلباء نے شکایتاً علامہ اقبال سے کہا۔

”شاعر ساری انسانیت کے لئے لکھتا ہے۔ لیکن آپ صرف مسلمانوں کے لئے ہی لکھتے ہیں۔ حالانکہ آپ پر سارے ہندوستان کی مختلف قوموں کا حق ہے۔“

علامہ اقبال تھوڑی دیر سوچتے رہے۔ پھر اُلٹا ان سے سوال کر دیا۔ ”آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ کے اپنے گھر میں آپ کے اپنے ماں باپ سخت بیمار ہوں تو ایسے میں آپ پہلے اُن کا علاج و تیمار داری کریں گے یا انہیں چھو کر دوسروں کی مدد کرتے پھریں گے؟“

اس پر وہ بولے:

”ظاہر ہے اپنے ماں باپ کا زیادہ اور پہلا حق ہے۔“

علامہ نے مسکرا کر کہا:

”اسلام اور مسلمان مجھے اپنے ماں باپ سے زیادہ عزیز

ہیں۔ آج مسلمانانِ ہند جس مصیبت میں مبتلا ہیں۔ میرے خیال

میں مجھ پر اور میری شاعری پر سب سے پہلا حق انہیں کا بنتا

ہے۔ اسی وجہ سے میں اُن کے لئے لکھتا ہوں۔ اگر میں ان کی

تکالیف اور مصیبت رفع کر سکا اور انہیں آزادی، عظمت، امن

☆ مرلیض: ”ڈاکٹر صاحب! میں کیا کیا کھا سکتا ہوں؟“
ڈاکٹر: ”آپ میری فیس کے علاوہ سب کچھ کھا سکتے ہیں۔“
(دانیال ناصر، لاہور)

☆ باپ (بیٹے سے): ”سناؤ پرچہ کیا ہوا؟“

بیٹا: ”بہت اچھا ہوا۔“

باپ: ”وہ کیسے، تم کچھ یاد کر کے تو گئے نہیں تھے۔“
بیٹا: ”پرچے پر لکھا تھا مندرجہ ذیل سوالات پر روشنی ڈالیں
اتفاق سے بلب میری سیٹ کے اوپر تھا میں نے پرچہ نیچے کر دیا
تو روشنی پڑتی رہی۔“

(آفتاب خواجہ، کراچی)

☆ ملا نصر الدین کا گدھا مر گیا تو کچھ شریر بچے اُن کے گھر آکر
رونے لگے۔ ملا نصر الدین کی بیوی بولی: ”تمہارا رشتہ دار مر گیا ہے۔
جو یوں رو رہے ہو۔“

ملا نصر الدین جلدی سے بولے: ”بیگم! انہیں رونے دو رونے دو، یہ
گدھے کے رشتے دار ہیں۔“

(حسنہ نور، پیر وال)

☆ ایک پاگل (دوسرے سے) ”میں بچپن میں مینار پاکستان سے گر
گیا تھا۔“

دوسرے پاگل نے پوچھا: ”تو پھر تم زندہ رہے یا مر گئے تھے؟“
پہلا بولا: ”مجھے یاد نہیں، میں اُس وقت بہت چھوٹا تھا۔“

(کشف منظور، راول پنڈی)

فقیر: ”اللہ کے نام پر کچھ دے دو۔“

صغیر: ”تمہارے پاس دس روپے کا کھلا ہے؟“

فقیر: ”جی ہاں!“

صغیر: ”تو پہلے اُسے خرچ کرو! پھر مانگنا۔“

(مشاء محمود، گوجرانوالہ)

ایک صاحب کی عادت تھی کہ راستے میں جب کسی سے ٹکراتے
تو کہتے: ”اے گدھے! دیکھ کر نہیں چل سکتے۔“ ایک دن اتفاق
سے وہ گدھے سے ہی ٹکرا گئے تو بولے: ”اب آپ کو کیا
کہوں۔ آپ تو بس آپ ہی ہیں۔“

(مریم ندیم، لاہور)



☆ ہوائی فوج کے نوجوان پیراشوٹ باندھ کر باری باری کودنے کی
مشق کر رہے تھے۔ جب آخری نوجوان کی باری آئی تو افسر بولا:
”ٹھہرو، تم نے پیراشوٹ تو باندھا ہی نہیں۔“

نوجوان نے جواب دیا: ”کوئی بات نہیں۔ صاحب یہ مشق ہی تو
ہے۔“ (ثروت یعقوب، لاہور)

☆ ایک خاتون (گوالے سے): ”تمہاری ایک بھینس کتنا دودھ دیتی
ہے؟“ گوالا: ”چھ کلو“

خاتون: ”اُس میں سے بیچتے کتنا ہو؟“

گوالا: ”جی، آٹھ کلو۔“ (محمد سعد منظور، راول پنڈی)

☆ پہلا دوست: ”میرے چچا بہت خوش نصیب تھے۔“

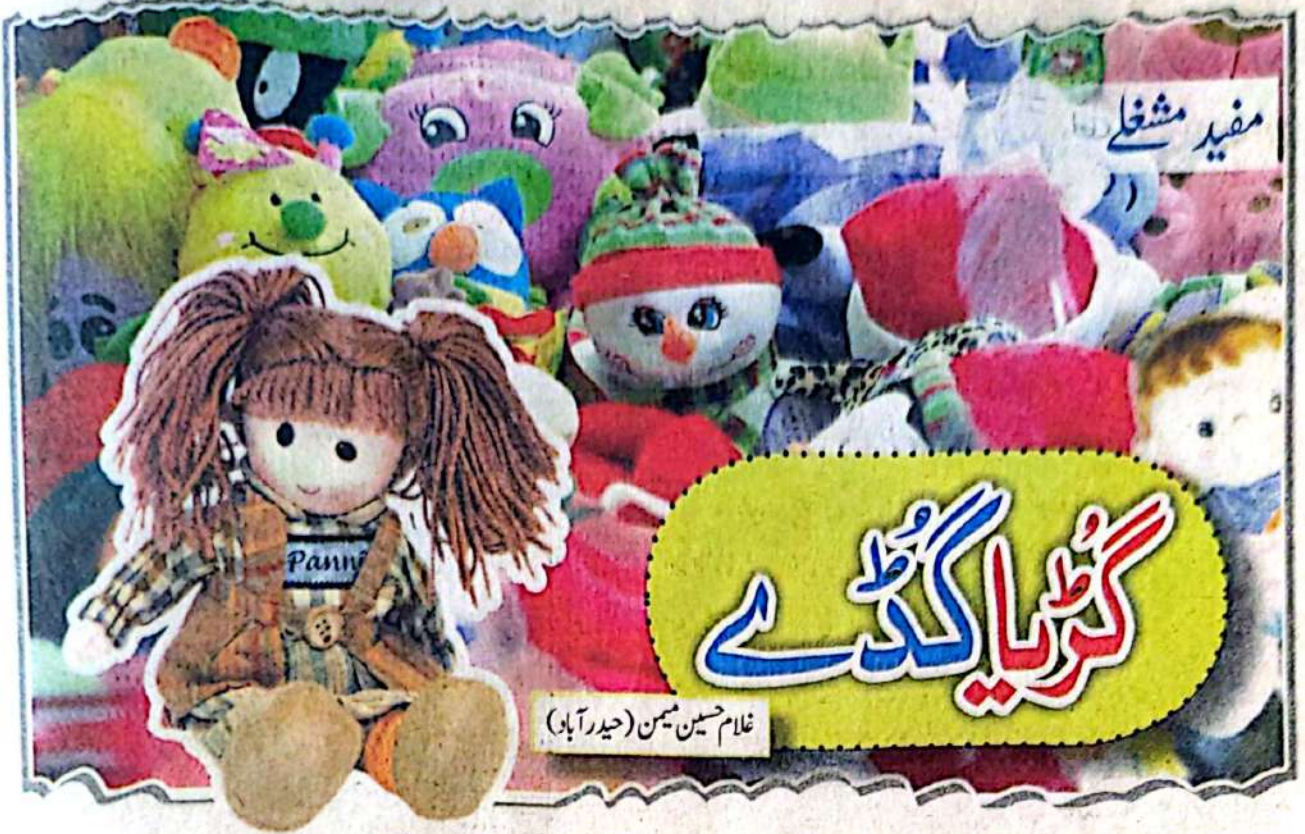
دوسرا دوست: ”وہ کیسے؟“

پہلا: ”انہیں چھ ماہ کی قید کی سزا ہوئی تھی، مگر پندرہ دن بعد ہی وہ
فوت ہو گئے۔“ (ثناء جمال، کراچی)

ایک آدمی نے بیرے سے کہا کہ ایک پیزالاؤ تو ویر نے اُس سے
پوچھا: ”بیرے کے چار پیس کروں یا آٹھ پیس؟“ اُس آدمی نے
جواب دیا: ”بے وقوف آٹھ پیس کرو کیوں کہ چار سے پیس نہیں
بھرے گا۔“ (امبر ذکاء، قلعہ دیدار سنگھ)

ایک صاحب نے اپنی سال گرہ پر دوستوں کو مدعو کیا۔ دوستوں نے
دیکھا کہ ایک کے بیچ موم بتیوں کی بجائے ایک بلب جل رہا تھا۔
دوستوں نے اُس کی وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا:

”دراصل میں ساٹھ سال کا ہو گیا ہوں۔ موم بتیاں بہت مہنگی تھیں
اس لیے ساٹھ واٹ کا بلب لگا دیا ہے۔“ (عائشہ اظہر، لاہور)



غلام حسین مین (حیدر آباد)

کہ اس دوران نمازیں اپنے وقت پر باقاعدگی سے ادا کرتی رہیں۔ یقیناً آپ یہ جاننا چاہیں گے کہ پہلی بار گڑیا کب اور کیسے بنائی گئی تو اس بارے میں تاریخ کے صفحات خاموش ہیں۔ ہاں البتہ مصر میں کھدائی کے دوران کپڑے کی ایسی گڑیاں برآمد ہوئی ہیں جن کے بارے میں قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ ہزاروں سال پرانی ہیں۔ برطانیہ کے مشہور عجائب گھر برٹش میوزیم میں بھی اس طرح کی کئی گڑیاں موجود ہیں۔ مصر کے علاوہ قدیم روم اور یونان میں بھی گڑیاں بنانے کا رواج تھا۔ روم اور یونان کے مقبروں کی کھدائی کے دوران ایسی گڑیاں بھی برآمد ہوئی ہیں جو انسانی جسامت کی ہیں۔ جدید فیشن کے لباس میں ملبوس گڑیاں بنانے کا رواج اب سے کوئی چھ سو سال پہلے فرانس سے شروع ہوا۔ انیسویں صدی میں بڑے پیمانے پر گڑیاں بنانے کا آغاز ہوا۔ یہ گڑیاں انسانی شکل و صورت سے خاصی ملتی جلتی تھیں۔ یہی وہ زمانہ ہے جب لڑکیوں نے گڑیاں جمع کرنے کے مشغلے کا آغاز کیا۔ یہ گڑیاں عام طور پر کپڑے سے بنائی جاتی تھیں۔ ان گڑیوں کا سر موم کا ہوتا تھا جو گرنے سے ٹوٹ جاتا تھا۔ پھر اس مشکل کا حل ان کا سر کاغذ اور گوند کے ایک مرکب سے تیار کر کے نکالا گیا۔

ساتھیو! آپ کو مفید مشغلوں کے بارے میں بتانے کا مقصد یہ ہے کہ آپ اپنے فارغ اوقات کو بے کار اور بے مقصد نہ گزاریں۔ ہمیں اُمید ہے کہ آپ صبح اٹھ کر نماز فجر اور تلاوت کلام پاک سے اپنے دن کا آغاز کرتے ہوں گے اور پھر اس کے بعد اسکول یا کالج جاتے ہوں گے۔ یہ سچ ہے کہ کامیابی کے حصول کے لیے اللہ سے رجوع کرنا بندے کے لیے انتہائی اہم ہے۔ یاد رکھیے ہم اپنے رب کو راضی کیے بغیر کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتے۔

ہم نے اب تک جتنے بھی مفید مشغلوں کے بارے میں آپ کو بتایا ہے وہ زیادہ تر لڑکوں سے متعلق ہی تھے، مگر انہیں لڑکیاں بھی شوق سے اپنا سکتی ہیں۔ آج ہم اپنی بچیوں اور بہنوں کے لیے مفید مشغلے میں ”گڑیا اور گڈے“ سے متعلق آپ کو بتا رہے ہیں..... گڑیا اور گڈے کے اس شوق کی تکمیل میں آپ اپنی چادر سے پاؤں باہر نہ نکالیں، مطلب یہ کہ اگر گڑیا یا گڈے کی سال گرہ، منگنی یا شادی کی تقریب منعقد کریں تو اپنے وسائل کا خیال ضرور رکھیں۔ فضول خرچی سے گریز کرتے ہوئے اپنے والدین پر انسانی بوجھ نہ ڈالیں۔ گھر کا کام بنانے اور اچھی اچھی کتابوں کو پڑھ کر علم حاصل کرنے کے بعد جو وقت بچے تو آپ یہ مشغلہ اختیار کر سکتی ہیں..... مگر یہ بھی یاد رہے

یہی وہ دور تھا جب چکنی مٹی سے بھی منھی مٹی گڑیاں بنانے کا آغاز ہوا۔ جن کی لمبائی دو انچ ہوتی تھی۔ انیسویں صدی کی تیسری دہائی میں جرمن میں ایسی گڑیاں بھی مارکیٹ میں آئی جو ”ماما“ اور ”پاپا“ کے الفاظ بولتی تھی۔ اس کے بعد آنکھیں کھولنے اور بند کرنے والی گڑیاں بھی مارکیٹ میں آئیں اور مقبول ہوئیں۔ اس کے بعد ایسی گڑیاں بھی بننے لگیں جو چلتی، کرب و کھاتیں اور موسیقی بھی سناتی تھیں۔ یہی وہ دور تھا جب پلاسٹک کی گڑیاں بنانے کا آغاز ہوا جس سے اس شعبے کو صنعت کا درجہ ملا اور پھر گڑیاں اتنی سستی بننے لگیں کہ اسے امیروں کے علاوہ غریب بھی خریدنے لگے اور اپنا شوق پورا کرنے لگے۔ تاریخ کی جو مشہور شخصیات اس مشغلے سے وابستہ رہی ہیں اور جن کے پاس گڑیوں کا ایک وسیع ذخیرہ رہا ان میں رومانیہ کی ملکہ میری اور نیدر لینڈ کی ملکہ ول ہیلمینا کے علاوہ برطانیہ کی ملکہ وکٹوریہ بھی شامل رہی ہیں۔ ملکہ وکٹوریہ ملکہ بننے سے پہلے گڑیاں جمع کرنے کی زبردست شوقین تھیں اور اس زمانے میں ان کے پاس دوسو کے لگ بھگ گڑیاں تھیں جن کے خوب صورت لباس وہ خود سیا کرتی تھیں۔

گڑیاں جمع کرنا اور ان سے کھیلنا تقریباً ہر لڑکی کا شوق ہوتا ہے۔ اکثر گھروں میں چند گڑیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو ان کی ماؤں، نانیوں یا دادیوں کے زمانے سے چلی آتی ہیں۔ اگر آپ بھی گڑیاں جمع کرنے کا مشغلہ اختیار کرنا چاہیں تو آغاز گھر میں موجود گڑیوں سے کیجئے اور پھر ان میں آہستہ آہستہ اضافہ کرتے جائیے۔ اس اضافے میں مختلف ممالک کی گڑیاں بھی شامل ہو جائیں تو یہ ایک اچھا ذخیرہ بن جائے گا، کیوں کہ مختلف رسم و رواج اور مختلف ممالک کے قومی لباس والی گڑیاں، دنیا بھر میں سب سے زیادہ مقبول ہیں۔ ان گڑیوں سے مختلف ممالک کے رسم و رواج اور لمبوسات کے بارے میں بھی جاننے کا موقع ملتا ہے۔

یہ شوق صرف گڑیاں جمع کرنے تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ پاکستانی بچیوں کا شوق ان گڑیوں کی گڈوں کے ساتھ شادی کرنا بھی ہے۔ جن بچیوں کے پاس گڈا ہوتا ہے وہ باقاعدہ رشتہ لے کر کسی ایسی بچی کے پاس جاتی ہیں جن کی گڑیا سے انہیں

اپنے گڈے کی شادی کرنی ہوتی ہے۔ پہلے منگنی اور پھر شادی کی تاریخ طے ہونے کے بعد شادی کی رسومات ہوتی ہیں اور پھر رخصتی کے موقع پر ہلکا پھلکا گڑیا کا فرنیچر اور برتن دیے جاتے ہیں۔ اس موقع پر کچھ بچیاں چھوٹی سی دعوت کا بھی اہتمام کرتی ہیں۔ کہنے کو تو یہ ایک کھیل یا بچوں کا مشغلہ ہوتا ہے، مگر اس طرح کھیل ہی کھیل میں ہماری بچیاں وہ بہت سی باتیں جان جاتی ہیں جو آئندہ زندگی میں ان کے کام آتی ہیں۔

ہمارے پڑوسی ملک بھارت کے شہر دہلی میں درگاہ حضرت نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک دو منزلہ ڈول میوزیم (گڑیوں کا عجائب گھر) ہے۔ جہاں مختلف شوکیس میں موجود رنگ برنگی گڑیاں دیکھنے والوں کو اپنی جانب کھینچتی ہیں۔ تقریباً ساٹھ سے زائد ممالک کی گڑیاں اپنے اپنے ملک کی نمائندگی کے لیے یہاں موجود ہیں۔ ان ممالک میں ایران، ترکی، اسپین، پرتگال، جاپان، چین، جرمنی، ڈنمارک، آسٹریا، آسٹریلیا، کینیڈا، کیوبا، رومانیہ، جنوبی و شمالی امریکا اور پاکستان کے علاوہ دیگر ممالک بھی شامل ہیں۔ ان گڑیوں کے ذریعے مختلف ممالک نے اپنے خطے کی تہذیب و ثقافت کو نمایاں کیا ہے۔ یہ گڑیاں مختلف ادوار کے بارے میں بتاتی ہیں۔ کپڑے کی بنی ان گڑیوں کے درمیان گڈے بھی موجود ہیں جو دیکھنے کے لائق ہیں۔ ان گڑیوں کے ذریعے زیورات کی نمائش کا کام بھی لیا گیا ہے۔

اب ہم آخر میں آپ کو ان گڑیوں کو رکھنے کے سلیقے کے بارے میں بتاتے ہیں۔ ان گڑیوں کو ان کے گھر میں رکھا جائے تو یہ محفوظ اور خوب صورت رہتی ہیں۔ یہ گھر کھلونوں کی بڑی بڑی دکانوں پر باآسانی مل جاتے ہیں۔ جو یقیناً مہنگے ہوتے ہیں۔ یہ گھر بنانا کوئی مشکل نہیں۔ آپ ذرا سی کوشش اور محنت کے بعد خود بھی بنا سکتی ہیں۔ آپ کسی ڈبے کو خوش نما کاغذ سے سجا کر گڑیا گھر میں تبدیل کر سکتی ہیں۔ نیچے پرانے کبل کا ٹکڑا بچھا دیں جو قالین کا کام دے سکے۔ اسی طرح گھر میں استعمال کی اشیاء کے خالی ڈبے اور آئس کریم کے خالی کپ بھی استعمال میں لایا جاسکتا ہے۔

---☆☆---



کھیل دس منٹ کا

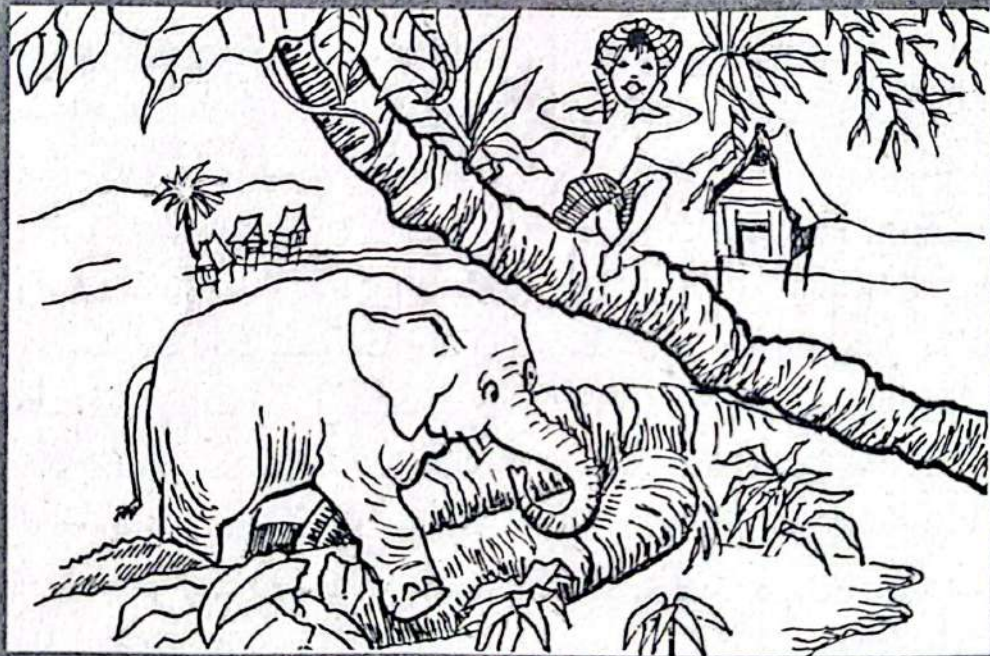


ش	خ	س	ر	ع	غ	ر	ڈ	خ	ش
ی	و	ر	د	ر	م	ٹ	ل	ن	ط
ط	ب	م	ف	و	ب	ر	ی	م	ع
ر	ف	خ	ص	ج	چ	گ	ا	ک	د
ل	ا	ے	ن	ا	و	آ	و	س	ا
ن	ا	م	ث	ع	ہ	د	ب	ا	ع
ہ	ز	م	ح	ب	ن	ش	ر	ع	م
ر	ن	ت	ر	گ	س	ل	و	ت	ذ
ا	ی	م	ٹ	د	ح	ز	ن	ب	ع
و	ا	ن	ش	خ	ا	ا	ش	و	ن

آپ نے حروف ملا کر دس نام تلاش کرنے ہیں۔ آپ ان ناموں کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں، اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن ناموں کو آپ نے تلاش کرنا ہے وہ یہ ہیں۔

عروج۔ نور۔ دانش۔ عمیر۔ اسد۔ عابدہ۔ دانیال۔ حمزہ۔ محسن۔ صفدر

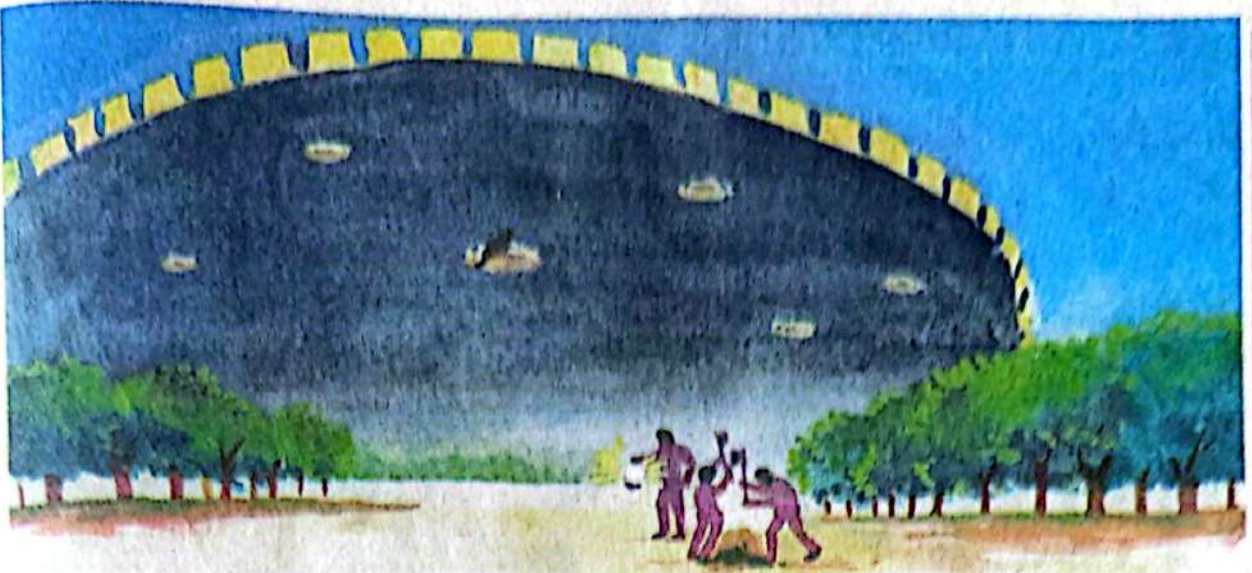
فرق تلاش کریں



یہ دونوں تصاویر بظاہر ایک جیسی لگ رہی ہیں، لیکن ان میں 5 جگہ پر فرق ہے۔

کیا آپ یہ فرق تلاش کر سکتے ہیں؟

39 **تلاش کریں** نومبر 2010



عارف شمیم روبیلا (حیدر آباد)

ظالم شکاری اور مینا

یہاں چھپا رہے ہیں۔ چوتھے روز سورج غروب ہونے کے بعد ہم یہ تمام سامان یہاں سے نکال کر آپس میں بانٹ لیں گے..... تب تک یہ معاملہ بھی ٹھنڈا ہو جائے گا۔“

”ٹھیک ہے ہمیں منظور ہے.....“ انہوں نے ایک ساتھ کہا، پھر تمام سامان گڑھے میں دبا کر اُن لوگوں نے قلعے کے اس حصے پر نشان لگایا اور وہاں سے چلے گئے۔

صبح ہوتے ہی مینا بیدار ہوئی اور مَکھر سے اڑی اور جلدی جلدی جنگل اور دریا کے پار جا کر دانہ چگنے لگی پھر واپس اپنے گھونسلے میں آتے ہی اُس نے اپنے بچوں کا پیٹ بھرا اور جب وہ اچھی طرح سے سیر ہو گئے تو مینا بھی اپنا پیٹ بھرنے کے لیے دریا پار چلی گئی، پورے گاؤں کا جائزہ لینے کے باوجود اُسے کہیں بھی ایسے حالات نظر نہیں آئے کہ جہاں چوری ہونے کا گمان ہو۔ دوپہر کے بعد تھکی ہاری مینا اپنے درخت پر واپس آ گئی۔

دوسری صبح موسم بہت خوش گوار تھا۔ بارش کی آمد آ رہی تھی۔ جیسے جیسے دن گزرتا جا رہا تھا مینا کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی اس کا بس نہیں چل رہا تھا، ورنہ وہ یہ مال اُس کے

جب قلعے کے نیچے سے آوازیں آنا شروع ہوئیں تو مینا نے ڈرتے ہوئے اپنے گھونسلے سے نکل کر قلعے کے نیچے جھانکا تو اُس کے بچے بھی نیچے جھانکنے کے لیے آگے بڑھے۔ غور کرنے پر اُسے قلعے کے نیچے چار آدمی نظر آئے۔ اُن میں سے ایک آدمی کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ دو آدمی قلعے کی دیوار کے ساتھ ہی گڑھا کھود رہے تھے، جب کہ ایک آدمی ارد گرد کے ماحول پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

دونوں آدمیوں نے نیچے خوب گہرا گڑھا کھودا اور ساتھ لائی ہوئی گٹھڑی کے کونے کھولنے لگے۔ کونے کھولتے ہی لالٹین لیے ہوئے آدمی نے اُسے آگے کر دیا۔ اب جیسے ہی لالٹین کی روشنی گٹھڑی کے سامان پر پڑی تو اُس میں موجود سونے چاندی کے زیورات برتن اور قیمتی سکے چمکنے لگے ان تمام چیزوں کو مینا نے بہت غور سے دیکھا۔ تمام سامان ایک بار پھر سب کو دکھانے کے بعد اُن میں سے ایک آدمی نے کہا:

”تمام سامان میں نے تم سب کو صرف اس لیے دکھایا ہے کہ تمہیں تسلی ہو جائے۔ تین روز کے لیے ہم یہ تمام سامان

میں تمہیں کل ہی حکیم صاحب کے سپرد کر دوں گا، پھر تمہاری قسمت.....“ شکاری نے نکال سا جواب دیا پھر وہ جال اور پنجرہ لئے بستی کی طرف بڑھ گیا۔

شکاری نے گھر میں داخل ہوتے ہی پنجرہ ایک جانب رکھا، اس کے قریب ہی اس کے دو معصوم بچے پیاری سی مینا کو دیکھ کر خوش ہونے لگے آخر وہ دونوں اٹھے اور پنجرے کے قریب آتے ہوئے بولے:

”بھائی! دیکھو تو یہ کتنی پیاری مینا ہے.....“

”ہاں یہ تو بہت پیاری مینا ہے۔“ دوسرے بچے نے بھی کہا۔

”پیارے بچو! میرے بھی تمہاری طرح دو معصوم بچے ہیں، تمہارا باپ مجھے پکڑ کر لے آیا ہے، میرے بچے رو رہے ہوں گے، تم مجھے آزاد کر دو..... میں اپنے بچوں کے پاس پہنچ کر تمہیں بہت دعائیں دوں گی۔“

معصوم مینا نے آنسو بہاتے ہوئے کہا تو شکاری نے اپنے بچوں کو ڈانٹتے ہوئے کہا:

”خبردار جو کسی نے اس پنجرے کو ہاتھ بھی لگایا۔ اپنے ابا کی آواز سنتے ہی دونوں بچے سمجھتے ہوئے پیچھے ہٹ گئے، کھانا کھاتے ہی شکاری نے پنجرے کو چھت کے ساتھ لگے ہوئے کنڈے سے لٹکا دیا اور خود باہر چلا گیا، ایسے میں مینا نے ایک بار اپنی سی کوشش کرتے ہوئے شکاری کی بیوی سے کہنا شروع کیا:

”بہن! تم تو ایک ماں کا درد سمجھ سکتی ہو، میں بھی ایک ماں ہوں۔ مجھ پر رحم کرو، میرے بھی ننھے سنے دو بچے ہیں اگر میں ان بچوں تک نہیں پہنچی تو وہ بھوکے مر جائیں گے۔“ یہ کہتے ہی مینا نے اپنے بچوں کو یاد کرتے ہوئے رونا شروع کر دیا۔

”پیاری مینا! ان بچوں کا باپ بہت ظالم ہے، میں نے اگر تمہیں چھوڑ دیا تو وہ مجھے مار مار کر گھر سے نکال دے گا، میرے بچے خوار ہو جائیں گے، تم اللہ سے دعا کرو، وہی بہتر حل نکالنے والا ہے۔“

مالک تک ضرور پہنچا دیتی، دوپہر کو مینا نہانے دریا کے پار گئی اس کے ساتھ اس کی بہت سی سہیلیاں بھی تھیں واپسی پر اُسے کھیتوں میں تازہ دانا نظر آیا تو اُس کی بھوک بڑھ گئی۔ اُس نے اپنی سہیلیوں کو تھوڑی دیر بعد آنے کا کہا اور خود کھیتوں میں اتر کر دانا چگنے لگی ابھی اُس نے چند دانے ہی چگے تھے کہ اچانک ہی وہ جال میں پھنس گئی، اُس نے خود کو جال سے نکالنے کی بہت کوشش کی، مگر جس قدر وہ کوشش کرتی اسی قدر پھنستی جاتی، آخر وہ افسوس کرتی ہوئی بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد اسے بڑے کھیت میں شکاری نظر آیا، اُسے دیکھتے ہی مینا کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی۔ خوف سے سہی ہوئی مینا نے پھر سے پورے زور کے ساتھ اڑنے کی کوشش کی، مگر وہ اڑ نہ سکی، کیوں کہ جال بہت مضبوط تھا۔ شکاری نے قریب آتے ہی فاتحانہ انداز میں جال میں پھنسی ہوئی پیاری مینا کو دیکھا تو بہت خوش ہوا..... اُس نے مینا کو جال میں سے نکال کر اپنے پاس موجود پنجرے میں قید کر لیا۔ مینا نے پنجرے سے بھی نکلنے کی بہت کوشش کی، مگر جب کسی طور بھی کوئی اُمید نظر نہیں آئی تو اس نے انتہائی عاجزی سے شکاری سے کہا:

”شکاری بھائی! میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے..... اللہ کے واسطے مجھے چھوڑ دو، اگر میں گھر نہیں پہنچی تو میرے بچے بھوکے مر جائیں گے۔“

”تمہیں پکڑنے کے لیے میں ایک ہفتے خوار ہوا ہوں اور آج جب تم میرے قبضے میں ہو تو کہہ رہی ہو کہ میں تمہیں چھوڑ دوں۔“

”مگر یہ ظلم ہے شکاری بھائی.....“ مینا نے کہا۔

”یہ میرا ذریعہ معاش ہے..... میں مجبور ہوں، اصل میں اس بستی میں ایک نواب صاحب ہیں انہیں کوئی تکلیف تھی تو حکیم صاحب نے انہیں بتایا کہ مینا کا گوشت تمہارے لیے اکسیر ہے، اسی لیے میں نے تمہیں پکڑا ہے۔“

”مگر شکاری بھائی، اپنے فائدے کے لیے کسی کی جان لینا تو انصاف کی بات نہیں..... یہ تو ظلم ہے۔“

”ہاں تم ٹھیک کہتی ہو، مگر میں نے کہا نا، میں مجبور ہوں،

سب گھر والے اتنی رات گئے جاگ کیوں رہے ہو اور گھبراے ہوئے کیوں ہو.....؟“ سپاہی کے کہتے ہی شکاری بولا۔
”میں تو نہیں گھبرا رہا.....“ شکاری کی شکل دیکھتے ہی سپاہیوں کو اس پر شک ہو گیا تھا۔ ایک سپاہی نے ساتھیوں سے کہا:

”تلاشی لو اس کے گھر کی.....“

یہ سنتے ہی دیگر سپاہی چور کو تلاش کرنے لگے، مگر انہیں چور نہیں ملا البتہ چور کی گٹھڑی اور اس کے منہ پر بندھا ہوا کپڑا مل گیا، اتنا ثبوت ملتے ہی سپاہی نے شکاری کو ڈانٹتے ہوئے کہا:
”بہروپے..... دن بھر شکار اور رات کو چوری کرتے ہو..... لے چلو اسے.....“

یہ کہتے ہی سپاہیوں نے شکاری کو پکڑا اور اُسے اپنے ساتھ لے جانے لگے۔ شکاری کی بیوی روتی ہوئی سپاہیوں کے پیچھے دوڑتی ہوئی بولی:

”اللہ کے واسطے انہیں جھوڑ دو..... یہ چور نہیں ہیں.....“ مگر انہوں نے اس کی ایک نہ سنی اور وہ شکاری کو لے گئے۔

اسی رات شکاری کی بیوی اپنے بچوں کو لیے اپنے بھائیوں کے گھر پہنچی اور انہیں اپنی دکھ بھری داستان سنائی۔ بھائیوں نے اپنی بہن کو یہی مشورہ دیا کہ وہ فی الحال خاموشی سے اپنے گھر چلی جائے کیوں کہ مال تمہارے ہی گھر سے برآمد ہوا ہے۔ صبح وہ قاضی کی عدالت میں پہنچ جائے۔ ہم بھی وہیں آجائیں گے۔“ بات معقول تھی اسی لیے شکاری کی بیوی پریشان حال واپس اپنے گھر واپس آ گئی۔

”کیا ہوا، کوئی حل نکلا.....؟“

”نہیں پیاری مینا! جو کام میرے خاوند نے کیا ہی نہیں..... اس کی سزا انہیں کیوں مل رہی ہے۔ صبح انہیں قاضی کی عدالت میں پیش کیا جائے گا، بھائی کہہ رہے ہیں کہ اگر مال کے اصل مالک نے انہیں پہچان لیا تو ان کا بچنا ناممکن ہے..... اب تو صرف دُعا کا ہی آسرا رہ گیا ہے، ہمیں کسی کی بددعا لگ گئی ہے۔“ شکاری کی بیوی نے روتے ہوئے اپنا

شکاری کی بیوی نے صاف جواب دیا۔ جواب سنتے ہی پیاری مینا ٹپ ٹپ آنسو بہانے لگی، شکاری رات کافی دیر سے گھر پہنچا، اُس نے آتے ہی اپنی بیوی سے کھانا مانگا اور کھانا کھاتے ہی بے خبری کی نیند سو گیا۔ رات نجانے کس پہر گلی میں شور ہوا، شکاری کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھا تو اسے ایک چور نظر آیا جو کہ اس کے گھر میں چھپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چور کے ہاتھ میں ایک کپڑے کی گٹھڑی تھی، شکاری کے دیکھ لینے پر چور بدحواس ہو کر واپس جانے کے لیے دیوار پھلانگنے کی کوشش کرنے لگا مگر شکاری نے فوراً ہی آگے بڑھ کر اُس کی ٹانگ پکڑ لی اور اسے پوری قوت سے واپس کھینچ لیا۔

اس زور آزمائی میں چور کے منہ پر بندھا ہوا کپڑا کھل گیا۔ چور زور آور تھا اُس نے شکاری کو دھکا دیا اور وہ لڑھکتا ہوا منکے کے پاس جاگرا اتنے میں چور دیوار پر چڑھا اور دوسری جانب کود گیا۔ یہ آوازیں سنتے ہی شکاری کی بیوی اور بچے بھی جاگ گئے، اچانک ہی دروازے پر بہت زور دار دستک ہوئی ایسے میں شکاری نے ہوشیاری کی اور چور کی گٹھڑی منکے کے پیچھے چھپادی اور خوف سے سہمتے ہوئے بولا:

”کون ہے بھائی.....؟“

”ہم سپاہی ہیں، تمہارے گھر میں چور کودا ہے، دروازہ کھولو.....“

”یہاں تو کوئی چور نہیں آیا صاحب.....“ شکاری نے غلط بیانی سے کہا، باہر سے پھر آواز آئی:

”دروازہ کھول..... ہمیں تمہارے گھر کی تلاشی لینی ہے۔“ تلاشی لینے کا سنتے ہی شکاری نے نہ چاہتے ہوئے بھی دروازہ کھول دیا، دروازہ کھلتے ہی سپاہی اندر آ گئے۔

”ابھی ابھی تمہارے گھر میں چور کودا تھا..... بتاؤ وہ کہاں ہے؟“ ایک سپاہی نے بہت غصے سے پوچھا۔

”میں نے آپ سے کہا ہے کہ یہاں کوئی چور نہیں آیا۔“ شکاری نے زور دیتے ہوئے کہا۔

”جھوٹ بولتے ہو، چور اسی طرف آیا تھا، اچھا یہ بتاؤ، تم

ہی رونے لگے۔ کافی دیر بعد چور کو عدالت میں حاضر کرنے کا بلاوا آیا تو سپاہی اُسے عدالت میں لے آئے دلائل اور ثبوت کی بنا پر شکاری پر چوری کا جرم ثابت ہو رہا تھا جب کہ مال کی اصل مالکہ نے بھی اپنے مال اور چور کو اس کپڑے سے پہچان لیا، اس وقت قاضی صاحب نے شکاری سے اپنی صفائی میں کچھ کہنے کا پوچھا تو وہ بولا:

”سرکار! میری بات کا یقین کریں..... میں چور نہیں ہوں۔“

”محترم قاضی صاحب اس کی بات کا یقین کر لیں، یہ واقعی چور نہیں ہے۔ اصل چور کوئی اور ہے جسے صرف میں جانتی ہوں۔“

مینا کے یہ کہتے ہی عدالت میں خاموشی چھا گئی۔
 ”رو برو آکر ثبوت دو کہ یہ چور نہیں ہے.....“
 قاضی صاحب نے مینا سے مخاطب ہو کر کہا تو شکاری کی بیوی نے فوراً پنجرہ قاضی صاحب کے سامنے رکھ دیا۔ مینا نے پھر کہنا شروع کیا:

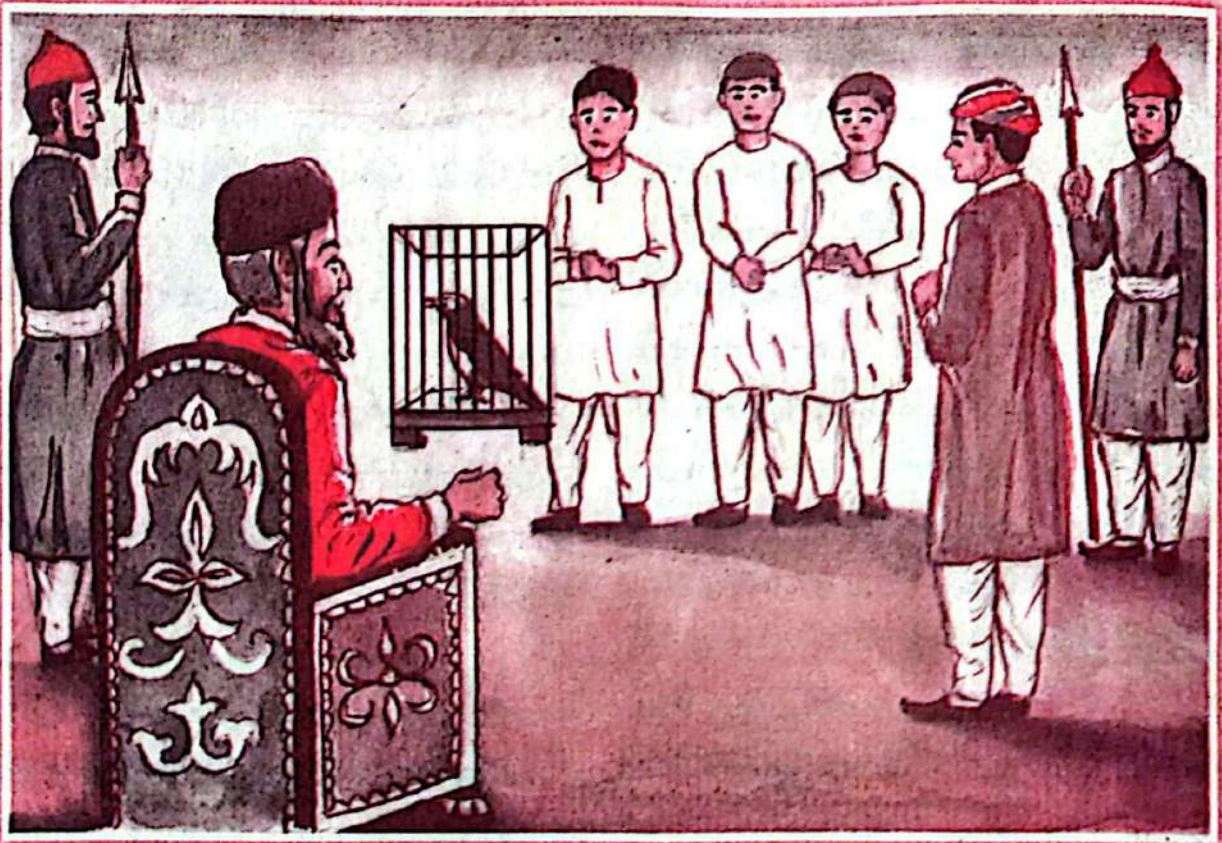
دکھڑا سنا۔
 ”ایسا نہیں کہو بہن! میں جانتی ہوں کہ شکاری چور نہیں ہے۔“ مینا بولی۔

”میں بھی تو یہی کہہ رہی ہوں، تم یہ کس طرح کہہ رہی ہو.....؟“ شکاری کی بیوی نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔

”بس تم بے فکر رہو، یہ بات صرف میں ہی جانتی ہوں کہ تمہارا شوہر چور نہیں ہے اور اصل چور کون ہے یہ بھی صرف میں ہی جانتی ہوں۔ صبح قاضی کی عدالت میں تم مجھے لے چلنا، یہ راز میں وہیں بتاؤں گی۔“

مینا کے یہ کہتے ہی شکاری کی بیوی کو ذرا تسلی ہوئی اور وہ صبح ہونے کا بے صبری سے انتظار کرنے لگی۔

صبح ہوتے ہی اُس نے اپنے بچوں اور مینا کو پنجرے سمیت لیا اور قاضی کی عدالت میں جا پہنچی۔ اس وقت چور کو دیکھنے کے لیے عدالت سے باہر بہت رش تھا، ایسے میں سپاہی اپنی کارگزاری پر بہت خوش تھے جب کہ شکاری معصومیت کا مجسمہ بنا آنسو بہا رہا تھا، چنو منو تو اپنے ابا کو دیکھتے



بکھرے موتی

- ☆ وعدہ پورا کر دو کیوں کہ قیامت کے دن وعدے کے بارے میں پوچھا جائے گا۔
- ☆ سچا دوست قیمتی ہیرے سے کم نہیں۔
- ☆ زبان کا دار تلوار سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔
- ☆ دوست نمادِ دشمن سب سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔
- ☆ علم ایک ایسا خزانہ ہے جو خرچ کرنے سے بڑھتا ہے۔
- ☆ اگر خدا کی رحمت کے امیدوار ہو تو مخلوق خدا پر رحم کرو۔

(نیل احمد، کراچی)

اُسی وقت قلعے کے گرد سپاہی لگا دیے گئے۔ رات کی تاریکی میں وہ چور قلعے کے نیچے آ کر گڑھا کھودنے لگے، ابھی انہوں نے تھوڑا ہی گڑھا کھودا تھا کہ سپاہی آگئے اور انہوں نے سب چوروں کو پکڑ لیا اور مال بھی برآمد کر لیا پھر انہیں قاضی صاحب کی عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ قاضی صاحب نے اُس سنار کو بھی بلوایا جس کا مال چوری ہوا تھا۔ اُس نے اپنے مال اور چوروں کو بھی پہچان لیا جب کہ چوروں نے بھی اپنے جرم کا اقرار کر لیا۔ دوسری صبح ان چوروں کے ہاتھ کاٹنے اور دس دس سال کی سزا سنائی گئی جب کہ شکاری کو باعزت بری کر دیا گیا۔ بری ہوتے ہی شکاری نے احسان مندانہ نظروں سے مینا کے پنجرے کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا:

”پیاری مینا! اگر تم مجھ پر احسان نہیں کرتیں تو میں بے گناہ مارا جاتا، اب میں کبھی پرندوں کو قید نہیں کروں گا، ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔“

”جو کام اللہ نے کسی سے لینا ہوتا ہے لے لیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ امانتیں مالکوں کو مل گئیں اور میں آزاد بھی ہو گئی، شکاری تمہیں بھی آزادی کی قدر معلوم ہو گئی ہو گی۔“ یہ کہتے ہی مینا پنجرے سے نکل کر بولی۔

”پیاری مینا! تم سچ کہتی ہو۔“ شکاری اور اس کی بیوی نے کہا، دوسرے ہی لمحے وہ پنجرے سے اڑی اور دریا کی طرف اپنے گھونسلے کی جانب روانہ ہو گئی۔

---☆☆---

”قاضی صاحب! اس نے مجھے کل ہی شکار کیا تھا اور کل رات ہی ایک چور مال کی گٹھڑی لے کر اس کے گھر میں کودا تھا، یہ پکڑا اسی چور کے منہ پر بندھا ہوا تھا، شکاری نے اُسے پکڑ بھی لیا تھا، مگر چور بہت طاقتور اور پھر پتلا تھا اس نے شکاری کو دھکا دیا اور مال کی گٹھڑی چھوڑ کر بھاگ گیا جب کہ یہ پکڑا گیا۔“

”اگر یہ چور نہیں ہے تو پھر چور کون ہے.....؟“ قاضی صاحب نے پوچھا۔

”چور کوئی اور ہے جسے صرف میں جانتی ہوں، مگر قاضی صاحب اس شکاری نے مجھ پر بہت ظلم کیا ہے۔ اس نے ذرا سے لالچ کی خاطر مجھے قید کر کے مجھے میرے بچوں سے دُور کر دیا ہے، اب آپ ہی بتائیے کہ ایسے شخص کے ساتھ کیا کیا جائے؟“

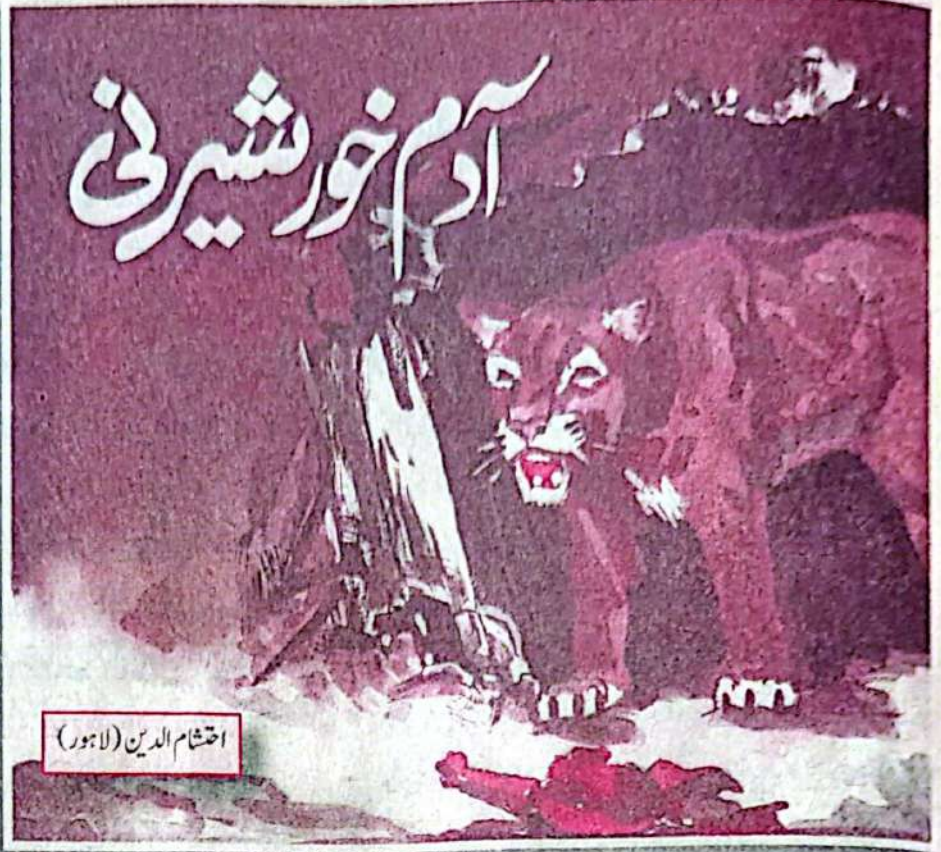
”پیاری مینا! میں اپنے کیے پر شرمندہ ہوں، اس وقت صرف تم ہی مجھے اس مشکل سے نکال سکتی ہو، اللہ کے واسطے میری مدد کرو۔“

شکاری نے قدرے روتے ہوئے عاجزی سے کہا تو مینا بولی:

”قاضی صاحب! چار دن پہلے بھی کچھ چوروں نے کسی دولت مند کے گھر میں چوری کی تھی، انہوں نے چوری کا مال قلعے کی دیوار کے ساتھ میرے سامنے دفن کیا تھا، وہ چور آج رات کو مال واپس لینے کے لیے وہاں آئیں گے اس جگہ کے بارے میں صرف میں جانتی ہوں، انہی چوروں میں وہ چور بھی شامل ہے جو کل رات شکاری کے گھر میں کودا تھا، کیوں کہ میں اسے پہلے بھی دیکھ چکی ہوں اور خوب پہچانتی ہوں، اگر میری بات غلط ہو تو جو چور کی سزا وہ میری سزا، محترم صرف آج رات کی بات ہے اگر وہ چور نہ بھی آئے تو وہ مال اس شکاری کو بے گناہ اور مجھے سچا ثابت کر سکتا ہے۔“

مینا کی بات میں وزن تھا۔ اس لیے مقدمے کی کارروائی اگلے دن تک کے لیے روک دی گئی۔ اس وقت مینا نے انتہائی رازداری سے قاضی صاحب کو قلعے کے نیچے گڑھے کا پتا بتا دیا۔

آدم خورشیری



احتشام الدین (لاہور)

بھی شامل تھا۔ ہم اب ایک بلند راستے پر چل رہے تھے جو دو پہاڑیوں کو آپس میں ملاتا تھا اور جس کے دونوں جانب وادیاں تھیں۔ یہ واقعہ دائیں جانب کی وادی میں پیش آیا تھا۔ وادی لمبی لمبی گھنی گھاس اور درختوں سے بھری ہوئی تھی۔ لڑکے نے انگلی کے اشارے سے بتایا کہ اس بلند مقام سے ایک ہزار میٹر کے فاصلے پر اور تقریباً ڈیڑھ ہزار میٹر نیچے یہ حادثہ

پیش آیا تھا اور اُس وقت اُس کی ماں وادی میں دوسری عورتوں کے ہمراہ گھاس کاٹ رہی تھی۔

اتنے میں پٹواری بھی پہنچ گیا۔ اُس کے ساتھ اُس کا ایک ملازم بھی تھا جس کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ پٹواری نے بتایا کہ ضلع کے افسروں نے اُسے شیر کے شکار کے لیے دو کٹوں کا انتظام کرنے کو کہا تھا اور یہ دونوں کٹے اس وقت دولت نگر لائے جا رہے تھے۔

یہ جنگل میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں نے نمبردار سے کہا کہ میں وادی میں اتر کر موقع پر جانا چاہتا ہوں۔ اس پر عورت کا لڑکا جس کا نام اللہ دتہ تھا، میرے ساتھ چل پڑا اور باقی لوگ اُسی بلند جگہ پر ٹھہر گئے۔ البتہ پٹواری اور اُس کا ملازم میرے ساتھ ہو لیے۔ شاید پٹواری کی رائے میں شیر کا شکار کوئی آسان کام تھا۔

ہم صرف چار سو میٹر تک ہوں گے کہ اللہ دتہ نے ایک نالے کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اُس جگہ شیر نے میری ماں پر حملہ کیا تھا۔ اللہ دتہ کے پیچھے پٹواری اور اُس کا ملازم آرہے تھے۔ میں نالے کی ریت میں شیر کے پاؤں کے نشانات تلاش

گاؤں دولت نگر میں ایک آدم خور شیرنی نے تباہی مچا رکھی تھی۔ ڈپٹی کمشنر خاصا پریشان تھا۔ لیکن جب میں نے آدم خور کو ختم کرنے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں تو اُس نے بڑی مسرت کا اظہار کیا اور گاؤں کے پٹواری کے ذریعے میری آمد کی اطلاع گاؤں بھیج دی۔ پٹواری ابھی گاؤں سے دس میل دُور ہی تھا کہ آدم خور نے 4 اپریل کو ایک اور لڑکا مار ڈالا۔ پٹواری اُسی شام دولت نگر پہنچ گیا تھا۔ 15 اپریل کو اسی گاؤں میں ایک عورت بھی آدم خور کا شکار ہو گئی۔ پٹواری چوں کہ میرا منتظر تھا اس لیے اُس نے عورت کی لاش کو محفوظ رکھنے کے لیے 30 آدمیوں کی ایک پارٹی اس مقام پر بھیج دی تھی جہاں شیر نے اُس عورت پر حملہ کیا تھا۔

میں گاؤں کی سمت جاتے ہوئے گھنے جنگل سے گزر کر ایک ندی کے کنارے پہنچا۔ اُس ندی کو میں نے اُن بڑے بڑے پتھروں کی مدد سے پار کیا جو اُس میں ایک فٹ کے فاصلے پر رکھ دیئے گئے تھے۔ نمبردار نے میرا استقبال کیا اور تھوڑی دیر میں وہ پارٹی بھی پہنچ گئی جو عورت کی لاش کی حفاظت کے لیے بھیجی گئی تھی۔ اس پارٹی میں اُس عورت کا سترہ سالہ لڑکا

اندر بھاگتا چلا جا رہا ہے۔ جب وہ ایک طرف مڑا تو نظر آیا۔ یہ تیسرا شیر تھا۔ وہ بلندی پر تھا اس لیے میں نے گولی چلا دی۔ میں نے دیکھا ہے کہ گولی کھا کر شیر مرنے سے قبل حرکت ضرور کرتا ہے لیکن اُس نے کوئی حرکت نہ کی۔ کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ نیچے کھسک رہا ہے۔ نیچے آٹھ دس فٹ اونچا، شاہ بلوط کا ایک درخت تھا۔ کھسکتا ہوا شیر اُس درخت میں یوں اٹک گیا کہ اُس کا سر اور اگلی ٹانگیں ایک طرف تھیں اور پچھلا دھڑ اور پچھلی ٹانگیں دوسری طرف لٹک رہی تھیں۔

جب دوسرے فار پر میں نے تین شیر دیکھے تو مجھے خیال گزرا کہ اُن میں ایک شیرنی ہے اور دو اُس کے بچے ہوں گے اور اُن میں ایک نہ ایک ضرور آدم خور ہو گا جس نے عورت کی لاش کھائی تھی اور اپنے ساتھیوں کی دعوت کا اہتمام بھی کیا تھا۔

میں چاہتا تھا کہ آگے بڑھوں اور مردہ شیر تک پہنچ جاؤں لیکن شیر تو کھسک رہا تھا۔ جوں ہی وہ ذرا نیچے ہوا، میں نے فار کر دیا۔ میں شرمندہ ہوں کہ نشانہ خطا گیا اور شیر غائب ہو گیا۔ اللہ دتہ چلایا:

”دیکھیے صاحب! وہ شیر جا رہا ہے۔“

میں سمجھا شاید شیر ہم پر حملہ کرنے والا ہے، لہذا میں نے رائفل سنبھالی۔ اللہ دتہ پھر بولا: ”صاحب، ادھر نہیں۔“

اور یہ کہ کر اُس نے اُس طرف اُننگی کا رخ کیا جہاں وادی ختم ہو جاتی تھی اور پہاڑی شروع ہوتی تھی۔ میں نے ایک شیر کو پہاڑی پر ترچھے رخ جاتے دیکھا۔ شیر لنگڑا کر چل رہا تھا۔ اُس کے دائیں شانے پر خون کا ایک بڑا نشان سا تھا۔ اس زخم سے معلوم ہوا کہ یہ وہی شیر ہے جو شاہ بلوط کے درخت سے اٹک گیا تھا کیوں کہ اُس کے شانے پر گولی لگی تھی۔ وہ تقریباً چار سو میٹر کے فاصلے پر تھا۔ میں نے درخت کی شاخیں ایک طرف ہٹائیں اور جوں ہی شیر سامنے آیا، رائفل کا گھوڑا دبا دیا۔ گولی شیر کے سامنے زمین میں دھنس گئی۔ شیر اُچلا لیکن پھر اسی حالت میں چلنے لگا۔ میں اب

کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے اُن سے کہا کہ باہر ہی ٹھہر جائیں اور خود احتیاط سے خشک نالے میں گھس گیا۔ باقی لوگ بلندی پر کھڑے تھے۔ اُن سے کوئی خاص اشارہ ملنے پر اللہ دتہ نے مجھ سے کہا کہ نیچے کوئی سرخ سی چیز نظر آرہی ہے۔ یہ سرخ سی چیز اُس کی ماں کے کپڑے بھی ہو سکتے تھے اور کسی جانور کی لاش بھی۔ میں نے پٹواری کے نوکر سے بندوق لے کر اُس کے کارتوس نکال لیے اور اُن سے کہا کہ وہ خاموشی سے درخت پر چڑھ جائیں۔

اب اللہ دتہ نے ایک اور بلند چٹان کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ اس جگہ سے ہم اُس سرخ چیز کو بخوبی دیکھ سکیں گے۔ ہم کہنیوں کے بل وہاں تک پہنچے اور نیچے نگاہ ڈالی۔ اُس جگہ اور خشک نالے کے درمیان شاہ بلوط کے پودے اور بڑی بڑی گھاس تھی۔ اسی خشک نالے میں آدم خور نے اللہ دتہ کی ماں کی لاش کھائی تھی۔ نالے کے ساتھ ہی ایک کھیت تھا جس میں چار پانچ فٹ اونچی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ اس گھاس پر دس دس فٹ کے فاصلے پر دو شیر لیٹے ہوئے تھے۔ ایک شیر کی پشت ہماری طرف تھی اور دوسرے کا پیٹ والا حصہ۔ ایک ذرا نزدیک تھا اور دوسرا ذرا فاصلے پر۔

میں نے گولی چلانے سے قبل اس بات پر غور کیا کہ اگر نزدیکی شیر پر گولی چلائی جائے تو اس کی آواز سے فاصلے پر سویا ہوا شیر پہاڑی کی طرف بھاگ جائے گا۔ اگر فاصلے پر سوئے ہوئے شیر پر گولی چلاتا ہوں تو دوسرا شیر میری طرف آئے گا۔ چنانچہ میں نے دور والے شیر کو پہلے نشانہ بنانے کا فیصلہ کیا، اُس کے دل کا نشانہ باندھا اور بندوق کا گھوڑا دبا دیا۔ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا، لیکن دوسرا شیر جست لگا کر اُٹھا اور دوسرے ہی لمحے وہ خشک نالے کی منڈیر پر تھا اور اُس کا رخ میری طرف تھا۔ میں نے ایک دم دوسرا فار کر دیا اور شیر پشت کے بل نالے میں جاگرا۔ اب وہ نظروں سے اوجھل تھا۔

میں نے اُس جگہ جہاں پہلے فار پر شیر مارا تھا گھس گھاس میں کچھ جنبش محسوس کی۔ لگتا تھا کہ جانور گھاس کے اندر ہی

چوتھی بار گولی چلاتا چاہتا تھا لیکن گولیاں ختم ہو چکی تھیں۔ شیر لنگراتا ہوا پہاڑی کی طرف بڑھتا گیا حتیٰ کہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

جو دو شیر میری رائفل سے مارے گئے تھے وہ نوجوان بچے تھے اور زخمی شیر دراصل شیرنی تھی اور وہی آدم خور تھی۔ میں زخمی شیرنی کے پیچھے چل پڑا۔ اُس چٹان پر جہاں شیرنی پر میں نے فائر کیا تھا، کچھ بال گرے ہوئے تھے اور خون کے نشانات بھی تھے۔ میں اسی سمت بڑھا لیکن خون کے نشانات کچھ فاصلے پر جا کر غائب ہو گئے۔ یہاں سے تین سو میٹر آگے لمبی گھاس کا ایک قطعہ تھا۔ ہو سکتا تھا کہ شیرنی وہاں موجود ہو۔ لیکن اب تاریکی چھا رہی تھی۔ اس لیے میں شیرنی کی تلاش کو دوسرے دن کے لیے ملتوی کر کے واپس آ گیا۔

دوسرے دن یعنی 8 اپریل کو ہم شیر کے بچوں کی کھالیں اتار رہے تھے کہ بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ میں نے اُن سے کہا کہ اگر وہ ہانکے کا انتظام کر دیں تو شیرنی پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ لوگ مان گئے۔ وہ میرے ملازمین کے ساتھ پہاڑی کی طرف چل دیئے اور میں پگڈنڈی پر ہوتا ہوا وادی میں ایک لمبی جگہ پہنچا جہاں وہ لوگ مجھے دیکھ سکتے تھے۔ میں نے اُن کو اشارہ کرنے کے لیے ہیٹ سر سے اٹھایا۔ انہوں نے تالیاں بجائیں، گلے پھاڑے، شور مچایا لیکن جھانپوں میں سے کچھ برآمد نہ ہوا۔ لہذا میں نے ہاتھ کے اشارے سے کہہ دیا کہ وہ اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں۔

اب میں وادی میں اُس طرف جا رہا تھا جدھر شیرنی گئی تھی۔ تقریباً نصف میل کے فاصلے پر ایک گہرا اور چوڑا خشک برساتی نالہ تھا۔ میں نے اُس میں چھلانگ لگا دی۔ یہ نالہ تیس میٹر چوڑا اور اسی فٹ گہرا تھا۔ میرے خیال میں اگر کوئی جانور اس میں گر جاتا تو اُس کی ہڈی پہلی سلامت نہ رہتی۔ بہر حال میں نے اترتے ہی اس میں ایک جانور موجود پایا۔ مگر یہ تو ہرن تھا جو اپنی گردن تڑوا بیٹھا تھا۔ میں آگے بڑھا تو نالے میں شیرنی کے پاؤں کے نشانات اس طرف بڑھتے ہوئے معلوم ہوئے جہاں نالہ کم گہرا تھا۔ اب یہ بات صاف

تھی کہ شیرنی اپنے زخم کی تکلیف سے اتنی پریشان تھی کہ اُس نے ہرن کی طرف دھیان نہ دیا۔ میں اُس مقام تک پہنچا ہی تھا کہ اچانک بارش کا پانی آگیا اور زمین پر خون کے پڑے ہوئے دھبوں کو بہا کر لے گیا۔ اب میرے لیے آگے بڑھنا مشکل تھا۔ میں وہیں سے اپنے کیمپ واپس لوٹ آیا۔

میں نے سات اپریل کو شیرنی پر فائر کیا تھا اور آج دس تاریخ تھی۔ میں ان چار دنوں میں گاؤں والوں کی کوئی خدمت نہ کر سکا تھا اور سخت شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ چنانچہ رات کے گیارہ بجے میں نے رائفل اٹھائی، ملازموں کو بلایا اور کہا کہ میں شیرنی کے تعاقب میں جا رہا ہوں۔ اگر کل رات تک واپس نہ آؤں تو وہ میرا کیمپ اٹھا کر شہر چلے جائیں اور میری فکر نہ کریں۔

میں کیمپ سے نکل کر اس مقام پر پہنچا جہاں شیرنی نظر آئی تھی۔ چاند کی روشنی میں جانوروں کے پاؤں سے بنے ہوئے راستوں پر شیرنی کے پاؤں کے نشانات کچھ نہ کچھ دیکھے جاسکتے تھے۔ میں انہی کی مدد سے آگے بڑھا اور ایک درخت کے نیچے آکر ٹھہر گیا۔ درختوں کی ٹہنیوں کے پٹنے سے میں نے معلوم کیا کہ اُن پر لنگور بیٹھے ہیں۔ میں اپنی پشت درخت سے لگا کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک شیرنی اندھیرے سے نکل کر چاندنی میں آکر بیٹھ گئی۔ وہ ٹہنیوں پر شور مچاتے ہوئے لنگوروں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

شیرنی اسی حالت میں تقریباً نصف گھنٹہ لیٹی رہی۔ اس دوران وہ کبھی کبھار مڑ کر ادھر ادھر دیکھ لیتی تھی۔ پھر اچانک وہ اٹھی اور بائیں جانب ایک خشک نالے کی طرف چل پڑی۔ اس وقت وہ زخم کی وجہ سے سخت تکلیف محسوس کر رہی تھی۔ میں درختوں کی آڑ لیتا ہوا اُس کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔ میری رفتار شیرنی سے زیادہ تھی۔ اس لیے ہمارے درمیان فاصلہ کم ہوتا گیا۔ اب وہ نالے کے نزدیک کھڑی تھی۔

اچانک وہ نالے میں کود گئی۔ اسی لمحے میں ایک درخت پر چڑھ گیا جو بارہ فٹ بلند تھا۔ رات گزرتی گئی، یہاں تک کہ مشرق کی طرف سے صبح کا اُجالا نمودار ہوا۔ میں درخت سے

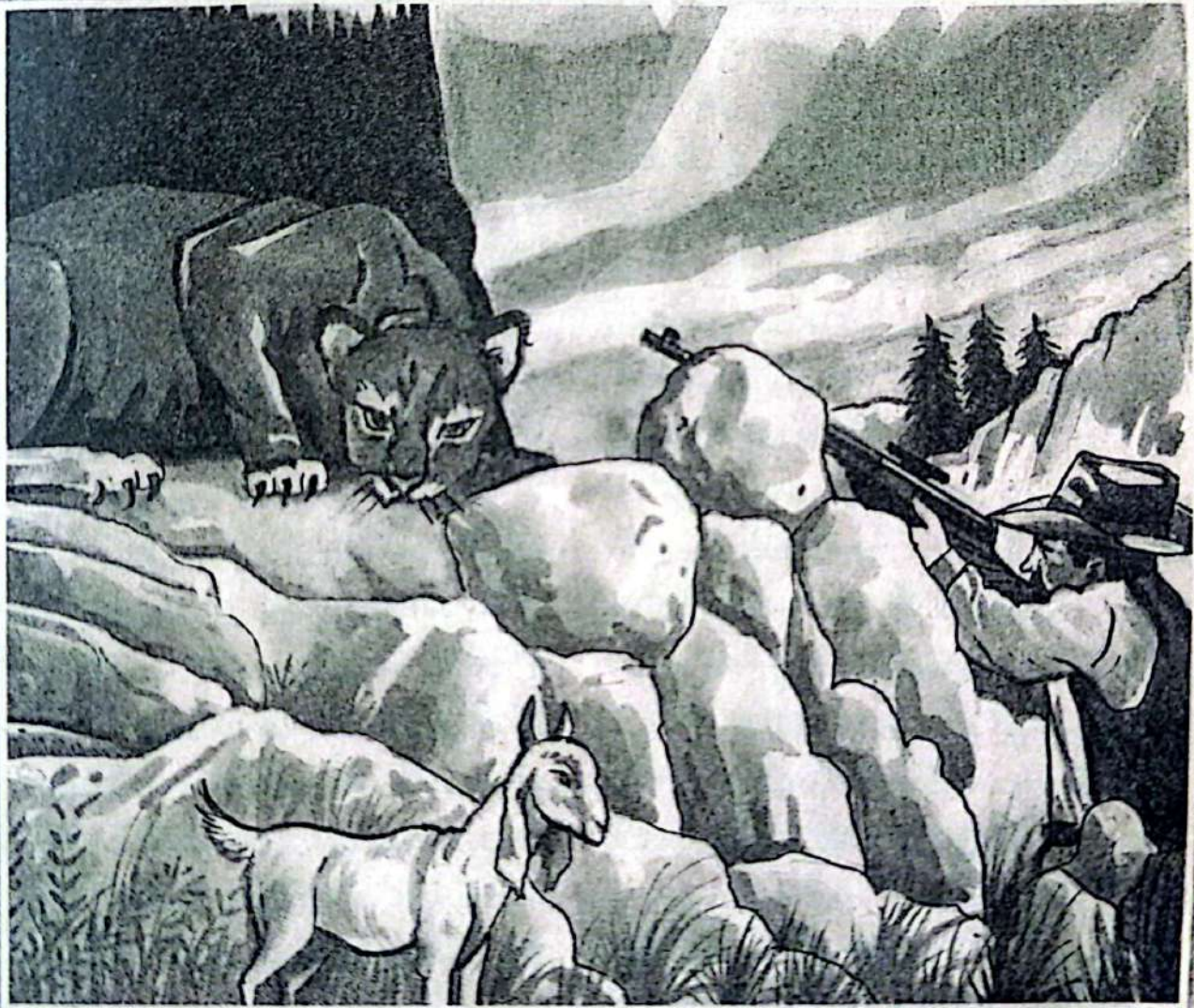
را کفل سنبالی اور اللہ دتہ کے ہمراہ چل دیا۔

ہم گاؤں سے پرے ایک پہاڑی پر چڑھ گئے۔ راستے میں ایک نالا بہتا تھا۔ ہم نے اُسے پار کیا۔ آگے کچھ گہرائی تھی اور یہاں تین بکریاں مردہ پڑی تھیں۔ مجھے بعد میں بتایا گیا کہ چند بچے بکریوں کا ریوڑ چراتے ہوئے ادھر سے گزر رہے تھے اور کچھ لوگ نزدیک ہی جلانے کی لکڑیاں اکٹھی کر رہے تھے کہ اچانک آدم خور شیرنی نمودار ہوئی اور اس نے چھ بکریاں مار ڈالیں۔ لوگوں نے شور مچایا تو شیرنی بھاگ گئی۔ لیکن افراتفری میں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کس طرح گئی ہے۔ تین بکریوں کو لوگ اٹھا کر لے گئے تھے اور تین بکریاں وہیں پڑی تھیں۔

جب یہ معلوم نہ تھا کہ شیرنی کس طرح گئی ہے تو ایسی

بیچے اُتر آیا اور کیمپ کی طرف چل دیا۔ راستے میں ایک ندی پڑتی تھی۔ میں نے اس پر ہاتھ منہ صاف کیا، گندے کپڑے دھوئے اور اچھی طرح نہایا۔ جب میں کیمپ میں پہنچا تو میرے ملازم مسرت سے آگے بڑھے۔ انہوں نے میرے بوٹ اتارے اور مجھے بستر پر لٹا کر کبیل اوڑھا دیا۔ بستر پر دراز ہوتے ہی میں سو گیا۔

نہ معلوم کتنی دیر تک میں سوتا رہا۔ اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے لوگ کہہ رہے ہوں کہ صاحب کو جگا دو۔ میرے ملازم ٹال مٹول کرتے رہے، لیکن لوگ نہ مانے۔ اُن کے شور سے میری آنکھ کھل گئی۔ اُن لوگوں میں اللہ دتہ بھی تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ ابھی ابھی آدم خور شیرنی نے چھ بکریاں مار ڈالی ہیں۔ نیند سے میں تازہ دم ہو گیا تھا۔ میں نے



صورت میں کسی طرف جانا فضول تھا۔ لہذا یہی فیصلہ کیا گیا کہ اسی جگہ انتظار کیا جائے۔ میں نے اللہ سے کہا کہ وہ گاؤں چلا جائے۔ جس گہرائی میں وہ بکریاں پڑی تھیں، اس کے نزدیک دو چٹائیں تھیں۔ اگلی کم اونچی اور پچھلی زیادہ اونچی تھی۔ میں نے یہی جگہ منتخب کی تاکہ پشت محفوظ ہو جائے۔ دن کے دو بجے تھے۔ میں چٹان کی اوٹ لے کر سر پر ہیٹ جما کر شیرنی کا انتظار کرنے لگا۔ پہلے چھوٹی قسم کے مردار خور پرندے آئے اور پھر گدھ منڈلانے لگے۔ وقت گزرتا گیا۔ پہاڑی پر پرندے بولنے لگے اور پھر مردار خور پرندے چیختے ہوئے اڑے۔ یہ شیرنی کی آمد کی علامت تھی۔

شام ہو رہی تھی کہ آدم خور شیرنی بکریوں کے قریب پہنچی۔ وہ بکریوں سے کچھ فاصلے پر درخت کی اوٹ میں اس طرح آکر بیٹھی کہ درخت کے تنے کے دائیں طرف اس کا سر اور بائیں طرف پچھلا دھڑ نظر آتا تھا۔ وہ کچھ دیر اسی طرح بیٹھی رہی۔ پھر اٹھی اور چند قدم آگے بڑھی۔ اب وہ میرے نشانے پر تھی۔ میں نے اس کے دل کا نشانہ باندھا اور گولی داغ دی، لیکن گولی شیرنی کے پیچھے زمین پر لگی جس سے مٹی اڑی اور شیرنی ایک جست لگا کر اور نیچے گہرائی میں کود گئی۔ میرا

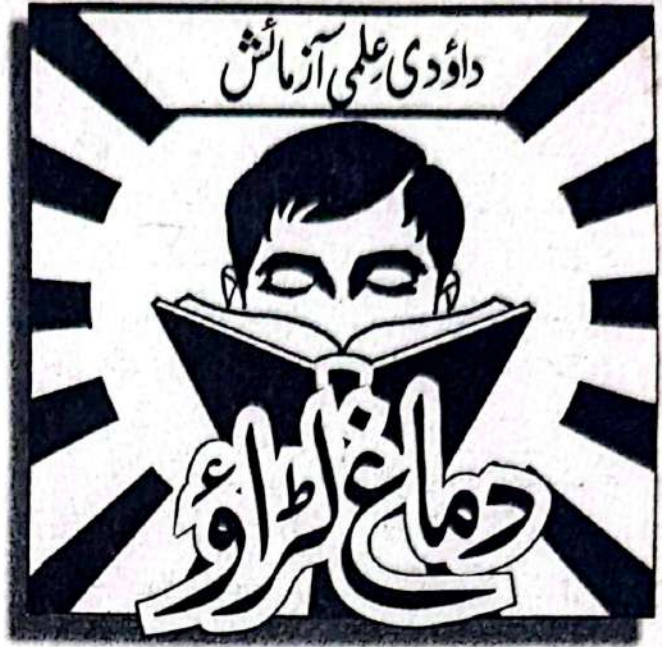
نشانہ خطا گیا تھا۔

اب میں ایک طرف جا کر گہرائی میں اُترا جہاں بڑی بڑی گھاس، اور ٹیڑھے میڑھے راستے تھے۔ لیکن میرے سر پر جنون سوار تھا۔ میں پانچ دن سے اسی آدم خور شیرنی کے تعاقب میں تھا لیکن عین وقت پر میری گولی ضائع ہو گئی تھی۔ میں آگے بڑھتا گیا۔ ایک مقام پر میں نے ایک درخت کی شاخوں کو ایک طرف ہٹایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ شیرنی چند گز کے فاصلے پر بیٹھی ہے اور مجھ پر جست لگانے کے لیے تیار ہے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک دم اُچھلی لیکن میں نے اسے جھپٹنے کا موقع نہ دیا۔ ایک ہی لمحے میں میری رائفل کی گولی اس کے جسم کے پار ہو گئی اور دوسری گولی نے اس کی گردن توڑ ڈالی۔

لوگ دُور اونچائی پر کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ میرے ملازم بھاگتے ہوئے آئے اور اس آدم خور شیرنی کو اٹھا کر دولت نگر لے گئے۔ انہوں نے کھال اتاری تو میں نے لاش کا معائنہ کیا۔ جو گولی میں نے 4 اپریل کو چلائی تھی۔ وہ اس کے شانے کے جوڑ میں اٹک کر رہ گئی تھی۔ دوسری اور تیسری گولیاں اس کے نہ لگی تھیں۔ پانچویں اور چھٹی گولی نے اس کا کام تمام کر دیا تھا۔

بلا عنوان کے یہ عنوانات بھی اچھے تھے

- ☆ نو میر میں سوا سیر۔
- ☆ غلیل سے پھٹنے والے اے پہلواں ہم نہیں۔
- ☆ آئیل مجھے مار۔
- ☆ غبارے کا انتقام۔
- ☆ پتھر پھینکنے والے، پتھر سے مت ڈر۔
- ☆ بھاگ نہ پائے ٹلن میاں۔
- ☆ لوجی، اب ہماری باری۔
- ☆ جیسا کام، ویسا انجام۔
- ☆ مونو بھیا! جیسی کرنی ویسی بھرنی۔
- ☆ نشانہ بنا، نشانے باز۔
- ☆ اب بچ کے دکھاؤ!
- ☆ چلے تھے میاں نشانہ لگانے۔
- (حسنہ عظیم، لاہور)
- (سیدہ تابندہ حیات، ساہی وال)
- (محمد حبیب الرحمن، اسلام آباد)
- (محمد نعمان، جہلم)
- (محمد فہد اعوان، راول پنڈی)
- (أسامہ زاہد، فیصل آباد)
- (ہادیہ جلیل، اسلام آباد)
- (فخر زمان، وہاڑی)
- (فاطمہ نصیر، راول پنڈی)
- (خوش بخت مشتاق، راول پنڈی)
- (کنزہ، فیصل آباد)
- (دانیال اکبر، میاں والی)



- 1- صفا و مرودہ 2- طاہرہ 3- حضرت عیسیٰ 4- اصحاب الشجرہ 5- عطارہ۔
- 6- قطب الدین ایبک 7- محمد حسین آزاد 8- سمیع اللہ 9- فرینڈ شپ ہائی
- وے۔ 10- آگ کا درجہ حرارت

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جا رہے ہیں۔

- ☆ رانا عبداللہ، لاہور (200 روپے کی کتب)
☆ محمد ذیشان قمر، کوئٹہ (175 روپے کی کتب)
☆ عبید اللہ، سرگودھا (125 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی:
☆ فیضیہ خالد جہلم۔ تہنیت شفقت لاہور۔ تنزیلہ اسلم گوجرانوالہ۔
محمد عتیق الرحمن اسلم آزاد کشمیر۔ محمد شادمان لاہور۔ وجیہ شبیر راول پنڈی۔
مرودہ شاہد بٹ سیال کوٹ۔ ارم نسیم خان کراچی۔ سید عون حسین
سرگودھا۔ قمر ناز دہلوی کراچی۔ حیدر زمان مرید کے۔ محمد علی فاروقی
رحیم یار خان۔ حافظ محمد معاذ کراچی۔ ربیعہ اقبال کراچی۔ عارفہ زاہد
لاہور۔ عطاء الرحمن چکوال۔ مراد اقبال لاہور۔ محمد جنید حفیظ ڈیرہ غازی
خان۔ عمارہ حسن راول پنڈی۔ بنت محمد طارق عبدالباری کراچی۔
کانٹات شہباز راول پنڈی۔ محمد حارث جمیل لاہور۔ ولید اشرف
گوجرانوالہ۔ حمزہ عظیم لاہور۔ فخر الزمان سیال دہاڑی۔ عبدالرحمان فیصل
آباد۔ عائشہ مجید لاہور۔ سید راشد علی رحیم یار خان۔ زاہد جمال
سرگودھا۔ اسامہ زاہد فیصل آباد۔ ربیعہ آفتاب راول پنڈی۔ محمد طلال قمر
سای، اقراء جہلم۔ اسد عباس گوجرانوالہ۔ وقاص شوکت فیصل آباد۔
عمار سرفراز قلعہ دیدار سنگھ۔ نمرہ شاہین سرگودھا۔ حفصہ سلیم قصور۔
سیدہ منقبت ایلیا سائی دال۔ نور فرید، خدیجہ فرید، ولید فرید، سیف اللہ
فرید کراچی۔ ہارون اشرف لاہور۔ عالیہ بتول کراچی۔ شہباز اکمل
چکوال۔ افتخار ڈار سیال کوٹ۔ ظہیر تبسم قصور۔ علی رضا لاہور۔ اسد
روڈ ماسٹر۔ محمد کامران بالا کوٹ۔ عامر اکبر نوشہرہ۔ محمد عاصم کوہاٹ۔

درج ذیل دیے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1- اصحاب عشرہ مبشرہ کو دنیا میں کس چیز کی خوش خبری پہلے مل گئی تھی؟

- i- اولاد ii- جنت iii- دولت

2- حضور کو نبوت ملنے کے بعد سب سے پہلے کون سا حکم نازل ہوا تھا؟

- i- نماز ii- روزہ iii- حج

3- قرآن مجید میں کس قصے کو احسن القصص کہا گیا ہے؟

i- قصہ حضرت موسیٰ ii- قصہ حضرت نوح iii- قصہ حضرت یوسف

4- حضرت ادریس علیہ السلام کس پیشے سے منسلک تھے؟

- i- کسان ii- بڑھئی iii- درزی

5- سمندر میں سب سے زیادہ معلوم کرنے کے لیے کون سا آلہ استعمال ہوتا ہے؟

- i- ہائیڈرو میٹر ii- جائیرو سکوپ iii- لیکو میٹر

6- سونے کا ایٹمی نمبر کیا ہے؟

- i- 79 ii- 80 iii- 77

7- روس کے کس شہر کو پانچ سمندروں کی بندرگاہ کہا جاتا ہے؟

- i- تاس ii- لینن گراڈ iii- ماسکو

8- افغانستان کا پرانا نام کیا تھا؟

- i- فارس ii- پنجتوستان iii- باختر

9- اقبال کی شہرہ آفاق نظمیں ”شکوہ“ اور ”جواب شکوہ“ ان کے کس

مجموعہ کلام میں شامل ہیں؟

- i- بال جبریل ii- بانگ درا iii- ضرب کلیم

10- علامہ اقبال کی نماز جنازہ کس جگہ ادا کی گئی تھی؟

- i- منو پارک ii- ناصر باغ iii- بادشاہی مسجد

بریل کے ساتھ کوہن چہاں کرن ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 نومبر 2010ء

دماغ لڑاؤ نام:

مقام:

پتا:

پوچھ کر گئے تھے کیا، تب نہیں آسکتے تھے جب امی..... "حمزہ روہا ہوا گیا۔

"کیا ہوا امی کو؟ کہاں ہیں وہ؟" اسد نے پوچھا۔
 "آپ کے جانے کے بعد امی بیمار پڑ گئی تھیں، تم سے ملنے کی کوشش کی، مگر تم تو اپنی مرضی کرتے ہو، آخری وقت پر بھی امی کی زبان پر تمہارا نام تھا۔ تم قاتل ہو..... تم نے....." پھر وہ آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

پھر اسد اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ بلک بلک کر رونے لگا۔ پھر گھر والوں کا رویہ رفتہ رفتہ ٹھیک ہوتا گیا۔ ایک دن اسے امی کی بہت یاد آئی تو وہ اُن کے کمرے میں چلا گیا۔ یکایک اُسے کچھ یاد آیا۔ اُس نے امی کی الماری کھولی تو ایسے اُن کی ڈائری نظر آئی۔ وہ جانتا تھا کہ امی اہم باتوں کو اپنی ڈائری میں تحریر کر لیا کرتی تھیں۔ اُس نے ڈائری کھولی تو یکم اکتوبر کو لکھی ہوئی یہ عبارت نظر آئی۔

"آج اسد کو گئے ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا ہے، وہ مجھے بہت یاد آتا ہے۔ اُس نے کوئی رابطہ بھی تو نہیں کیا۔ اللہ کرے وہ خیریت سے ہو۔"

10 اکتوبر

"آج میں نے کڑا ہی گوشت بنایا ہے۔ اسد کا پسندیدہ سالن، مگر وہ تو ہے ہی نہیں۔ ارادہ کیا ہے جب تک اسد واپس نہیں آتا میں کچھ نہیں کھاؤں گی۔"

21 نومبر

"میری طبیعت کئی دنوں سے خراب ہے۔ ہلکا ہلکا بخار ہے۔ اسد کے ابو کہتے ہیں کہ میں ہر وقت اس کے متعلق سوچتی رہتی ہوں، کیا کروں آخر وہ میرا بیٹا ہے۔ ماں کو بیٹے کی یاد نہیں آئے گی تو پھر کس کی آئے گی۔"

15 دسمبر

"نیا سال شروع ہونے میں دو ہفتے ہیں مگر اسد کی کچھ خبر نہیں، پتا نہیں اُس کی ناراضگی کب ختم ہو گی۔ میں آج ڈاکٹر کے پاس گئی تھی۔ انہوں نے کہا کہ میں اپنے ذہن پر بوجھ نہ ڈالوں، مگر مجھے اسد کی یاد ہر وقت ستاتی ہے۔ جاتے ہوئے وہ مجھے ملا بھی تو نہیں تھا۔"

10 جنوری

"کبھی کبھی دل میں درد ہونے لگتا ہے۔ اسد کی یاد



میں ناراض نہیں ہوں (معروف رفیق، رحیم یار خان)

اسد چھ ماہ بعد گھر لوٹا تھا۔ وہ چھ ماہ قبل گھر والوں سے ناراض ہو کر کسی کو کچھ بتائے بغیر گھر سے چلا گیا تھا۔ پھر احساس ہونے کے بعد وہ خود ہی گھر لوٹ آیا تھا۔ اس کے گھر سے جانے کی وجہ یہ تھی کہ اُس نے گاڑی لینے کی مذمت کی تھی۔ ابو جان کا کاروبار اُن دنوں خسارے میں چل رہا تھا۔ جب اُس کی ضد پوری نہ ہوئی تو وہ ناراض ہو کر گھر سے چلا گیا۔ جب وہ گھر میں داخل ہوا تو کسی نے اُس سے بات نہ کی۔ بہن نے دیکھا تو بے رخی سے منہ موڑ لیا۔ حمزہ نے بھی بات نہ کی۔

"حمزہ! تم بھی مجھ سے ناراض ہو۔" حمزہ نے غصے سے کہا: "تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے؟"

اسد کو دھچکا سا لگا: "کیا ہوا تمہیں، میں تمہارا بھائی ہوں، اگر ملنا نہیں چاہتے تو نہ ملو مگر ایسا مت کہو۔"

"تم واپس آکر احسان کیوں جتلا رہے ہو؟ ہم سے



آخر میں اپنے گھر کی جانب روانہ ہو گیا کیوں کہ میں نے بھی عید منانی تھی۔

وقت گزارتا گیا اور اب عید قربان قریب تھی اور آخر عید کا دن بھی آن پہنچا۔ آج پھر میں مسجد کے باہر کھڑا ہوں۔ تھوڑی دیر میں عید کی نماز ختم ہوئی تو لوگ ایک دوسرے سے گلے ملنے لگے۔ پھر وہی سوال میرے ذہن میں گردش کرنے لگا کہ ”آخر یہ لوگ مجھ سے عید کیوں نہیں ملتے۔“ پھر مسجد آہستہ آہستہ خالی ہو گئی۔ اسی اثنا میں نے ایک بچہ دیکھا جو کہ اپنے ابو کو کہہ رہا تھا کہ ”ابو! انکل سے تو عید مل لیں۔“

بچے کے ابو میرے پاس آئے اور مجھ سے عید ملنے لگے۔ بچے نے مجھے دیکھ کر کہا: ”انکل! آپ سے عید ملنے کو نہیں بلکہ سلوٹ کرنے کو دل کرتا ہے۔“

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ آخر میں کون ہوں تو جناب میں وہ سیکورٹی گارڈ ہوں جو عید کے موقع پر جامع مسجد کے باہر نمازیوں کی حفاظت کرتا ہے اور اپنے فرائض کو نبھانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ مجھے نمازیوں سے یہ گلہ ہے کہ آخر عید کی نماز کے بعد وہ مجھے عید کیوں نہیں ملتے۔ میں بھی تو مسلمان ہوں۔ میں تو اپنی عید کی نماز ترک کر کے دوسرے مسلمان بھائیوں کی حفاظت کرتا ہوں۔ میرا دل بھی چاہتا ہے کہ کوئی مجھ سے عید ملے۔ کیا آپ میری یہ خواہش پوری کر سکتے ہیں؟ جب آپ اس مرتبہ عید کی نماز پڑھنے جائیں تو مجھ سے ضرور عید ملیئے گا۔ آپ کے ایسا کرنے سے میں خوش ہو جاؤں گا۔

(دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

بادشاہ، ہرن اور درویش

(نور اللہ نور، ڈیرا اسماعیل خان)

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک ملک پر ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ بادشاہ شکار کا بہت شوقین تھا۔ ایک دن بادشاہ نے درباریوں کو بلایا اور دوسرے دن شکار پر جانے کا پروگرام بنایا۔ درباریوں میں سے عبداللہ اور مجید بادشاہ کے ساتھ شکار پر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

دوسرے دن بادشاہ کے گھوڑے کو خوب شکری ساز و سامان

بہت ستاتی ہے۔ مجھے لگتا ہے آخری وقت قریب ہے۔ پتا نہیں اُسے دیکھ بھی سکوں گی یا نہیں۔“

اسد کو اپنے کندھوں پر بوجھ محسوس ہوا۔ اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ابو اور حمزہ کھڑے تھے۔ ابو نے کہا: ”ابھی تم نے پوری ڈائری نہیں پڑھی، آگے پڑھو۔ اسد نے صفحہ پلٹا تو آگے لکھا ہوا تھا۔

”جب میرا بیٹا واپس آئے تو اُسے معاف کر دینا کیوں کہ ماں اپنے بچوں سے کبھی ناراض نہیں ہوتی، میں بھی ناراض نہیں ہوں۔“

(پہلا انعام: 200 روپے کی کتب)

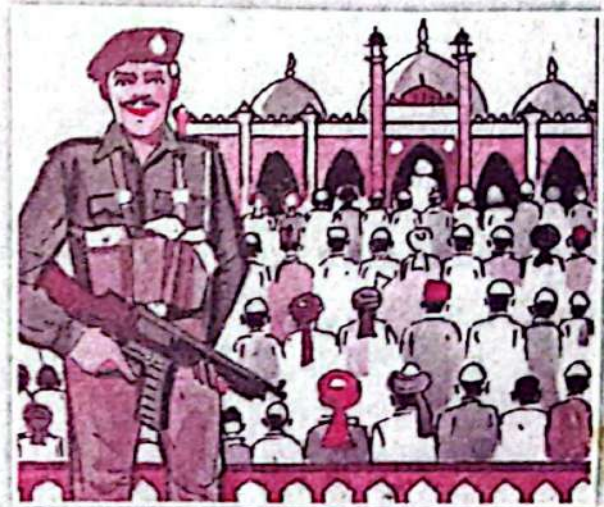
میں کون ہوں؟

(انجینئر برہان محمود خالد، ڈیرہ غازی خان)

وہ عید الفطر کا دن تھا اور میں مسجد کے باہر کھڑا لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ تمام لوگ ایک دوسرے سے عید مل رہے تھے ”عید مبارک“ کی صدائیں اس مجمع میں با آسانی سنی جاسکتی تھیں۔ پھر تمام لوگ عید ملنے کے بعد اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے اور آہستہ آہستہ مسجد خالی ہو گئی۔ اُس وقت میں اپنے آپ سے یہ سوال کر رہا تھا۔

”آخر یہ لوگ مجھ سے عید کیوں نہیں ملتے، میں بھی تو انسان ہوں اور مسلمان ہوں..... پھر کیوں یہ لوگ مجھ سے عید نہیں ملتے؟“

اس طرح کے سوالات میرے ذہن پر دستک دے رہے تھے۔ مگر ان سوالات کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔



سے لیس کیا گیا۔ زین کے ایک طرف تیروں سے بھرا ترکش باندھا گیا اور دوسری طرف شکار بند لٹکایا گیا پھر گھوڑے اصطبل سے باہر لائے گئے۔

پھر تھوڑی دیر بعد تینوں گھوڑے پر سوار ہو کر جنگل کی طرف چل دیئے۔

چلتے چلتے وہ ایک گھنے جنگل میں پہنچ گئے۔ سورج کافی چڑھ چکا تھا، دھوپ کی تہذت کی وجہ اُن کے چہرے سرخ ہو رہے تھے بادشاہ کو پیاس کا شدید احساس ہوا۔ انہوں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی مگر کہیں بھی پانی نظر نہ آیا۔ وہ تھوڑی دیر گئے تھے کہ بادشاہ کو درختوں کے جھنڈ میں ایک جھونپڑی دکھائی دی۔

بادشاہ اور درباری جھونپڑی کے قریب گئے۔ بادشاہ دروازے پر پہنچا اور اندر آنے کی اجازت چاہی۔

”بیٹا! اندر آؤ۔“ بڑھیا نے کہا۔

بادشاہ جھونپڑی کے اندر چلا گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ زمین پر بھی چٹائی پر ایک نحیف و زار سی بڑھیا بیٹھی گوشت بھن رہی ہے۔ ایک کونے میں پانی کی ایک پڑی صراحی تھی جس پر مٹی کا پیالہ پڑا تھا۔ بادشاہ صراحی دیکھتے ہی آگے بڑھا اور خوب سیر ہو کر پانی پیا اور ساتھ ہی اپنے درباریوں کو آواز دی۔

درباریوں نے گھوڑے درختوں کے ساتھ باندھے اور جھونپڑی میں داخل ہو گئے، پھر درباریوں نے خوب سیر ہو کر پانی پیا اور اللہ کا شکر ادا کیا۔

اس کے بعد بڑھیا نے بھنا ہوا گوشت ایک پلیٹ میں رکھ کر بادشاہ اور درباریوں کے سامنے پیش کیا۔

”یہ گوشت تم نے کہاں سے حاصل کیا ہے؟“ بادشاہ نے



پوچھا۔

”یہ گوشت شکار کا ہے جو میرا بیٹا لایا ہے۔“ بڑھیا نے کہا۔
بادشاہ اور درباری شکار کے گوشت کا سن کر خوب مزے مزے سے گوشت کھانے لگے۔

جاتے وقت بادشاہ نے چند سونے کے سکے بڑھیا کی طرف بڑھائے جو بڑھیا نے خوشی خوشی قبول کر لیے۔

بادشاہ اور درباری گھوڑوں پر سوار ہو کر آگے بڑھے اور ایک گھنے جنگل میں گھس گئے۔ جنگل میں بُو کا عالم تھا۔ چاروں طرف دیو قامت درخت ہی درخت دکھائی دے رہے تھے۔ سورج اپنی منزل کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ دُور سے بلبل کے چہچہانے کی آواز آرہی تھی۔ بادشاہ اور درباری آواز کی سمت بڑھتے گئے۔ کچھ دُور جا کر انہوں نے دیکھا کہ ایک بلبل شاخ پر بیٹھی چہچہا رہی ہے۔ بادشاہ اور درباری بغیر توقف کے آگے بڑھتے گئے کہ اچانک بادشاہ کو جھاڑیوں میں کوئی جاندار چیز ہلتی ہوئی نظر آئی۔

بادشاہ نے گھوڑے کو ایڑ لگائی، کیا دیکھتے ہیں کہ جھاڑیوں میں ایک ہرن لیٹا ہوا تھا بادشاہ نے تیر چلایا تو تیر سیدھا ہرن کی ران میں پیوست ہو گیا، ہرن نے پھرتی سے چھلانگ لگائی اور بھاگ گیا۔

بادشاہ ہرن کے پیچھے گھوڑا دوڑاتے ہوئے اتنا آگے نکل گیا کہ اُس کے درباری بہت پیچھے رہ گئے۔ ہرن تیر کھا کر جھاڑیوں میں غائب ہو گیا، بادشاہ نے بہت سی جھاڑیاں چھان ماریں، مگر ہرن غائب ہو چکا تھا۔

بادشاہ بہت تھک چکا تھا۔ پھر وہ مایوسی کے عالم میں ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے وہاں پر ایک عمر رسیدہ درویش کو درخت کے سائے میں مصروفِ عبادت دیکھا۔ بادشاہ اٹھا اور درویش کی خدمت میں پہنچ کر بولا:

”کیوں باباجی! ادھر کوئی ہرن تو نہیں آیا۔“

درویش نے سوچا۔ اگر ہرن کا پتہ بتاؤں تو ہرن کی جان جاتی ہے اور اگر یہ کہوں کہ میں نے ہرن کو نہیں دیکھا تو خواہ مخواہ جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔ درویش نے سوچا کہ کس طرح ہرن کی جان بچائی جائے اور بادشاہ کو ہرن کے شکار سے باز رکھا جائے۔

تھوڑی دیر کچھ سوچ کر درویش نے سر اٹھا کر کہا: ”بادشاہ سلامت! دیکھنا آنکھ کا کام ہے، لیکن وہ بول نہیں سکتی، بولنا زبان کا

بہتان، غیبت، لڑائی جھگڑا، بدزبانی، عیب جوئی، نکتہ چینی، طعنہ زنی، خوشامد، لعنت کرنا، بلاوچہ تنقید، افواہ پھیلانا اور مبالغہ آمیزی وغیرہ۔

ان سب گناہوں کی آلہ کار زبان ہی بنتی ہے، اسی لیے زبان کو ہر وقت قابو میں رکھنے کی تاکید ہے۔ اگر زبان پر گرفت ڈھیلی پڑ جائے تو یہ چھوٹی سی چیز قابو سے باہر ہو جاتی ہے جو دُنیا میں بھی پچھتاوے کا باعث بنتی ہے اور آخرت میں بھی باعث نقصان ہو گی۔ بعض اوقات انسان اپنی زبان سے کوئی بات نکالتا ہے اور اُس کو اپنے نزدیک بہت معمولی درجے کی بات سمجھتا ہے۔ اگر وہ بات حق ہوتی ہے تو یہ معمولی سی بات جنت میں اُس کی بلندی کا سبب بن جاتی ہے اور اگر وہ بات باطل ہو تو وہی انسان کو دوزخ میں لے جانے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب صبح ہوتی ہے تو انسان کے سب اعضا زبان کے آگے عاجزی کرتے ہیں اور کہتے ہیں تو ہمارے معاملے میں اللہ سے ڈرو کیوں کہ ہم تیرے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ تو ٹھیک رہی تو ہم بھی ٹھیک رہیں گے، اگر تو نے غلط روی اختیار کی تو ہم بھی غلط روی اختیار کر لیں گے اور پھر اس کا خمیازہ بھگتیں گے۔“

جو شخص اپنی زبان کو قابو میں نہیں رکھتا وہ اکثر پشیمان ہوتا ہے۔ جس شخص کی زبان اُس پر حکمران ہو تو وہی اُس کی ہلاکت کا فیصلہ کرتی ہے اس لیے ہر جگہ، ہر مجلس میں، ہر لمحہ زبان کی حفاظت کرنی چاہیے۔

خواجہ حسن بصریؒ فرماتے ہیں: انسان پر تعجب ہے کہ کرانا کا تین اس کے آس پاس ہیں۔ اس کی زبان ان کا قلم ہے اور اس کا لب قلم کی سیاحی۔ جیسے جیسے انسان کی زبان چلتی ہے فرشتوں کا قلم چلتا رہتا ہے اور زبان رکتی ہے تو قلم بھی رک جاتا ہے۔ ایک صحابیؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: ”یا رسول اللہ! سب سے خطرناک چیز جس کا آپ کو ہم سے اندیشہ ہو، کیا ہے؟“ جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان پکڑی پھر فرمایا: ”یہ زبان۔“ (ترمذی)

کام ہے لیکن وہ دیکھ نہیں سکتی۔ آنکھوں نے ہرن کو دیکھا ہے، لیکن وہ کیسے بتا سکتی ہے۔ بتانا زبان کا کام ہے، مگر زبان نے دیکھا نہیں لہذا وہ کیسے بتا سکتی ہے۔“

بادشاہ درویش کا جواب سن کر لاجواب ہو گیا۔ اور آئندہ شکار کھیلنے سے توبہ کر لی۔

(تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

زبان سنبھالیے

(ذیشان قریشی، لاہور)

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو بیش بہا نعمتیں عطا کی ہیں، اُن میں سے ایک قوتِ گویائی یعنی بولنے کی نعمت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اسی نعمت کی وجہ سے انسان دوسری جان دار مخلوقات اور حیوانات سے افضل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زبان جیسی نعمت عطا کر کے اسے ایک دائرہ کار کا پابند بھی کیا ہے اور انسان کو ہدایت کی ہے کہ وہ اُسے لگام دے اور قابو میں رکھے اور جب بولے اچھی اور بھلی بات ہی بولے۔ یعنی وہی بات زبان سے نکالے جس سے دُنیا و آخرت میں خیر اور بھلائی نصیب ہو۔

یہ زبان خیر و شر دونوں کے بولنے پر قدرت رکھتی ہے۔ ایمان کا اظہار اور ایمان کی شہادت بھی اسی زبان کے ذریعے سے ہوتی ہے اور انکار یعنی کفر کی مرتکب بھی یہی زبان بنتی ہے، اسی لیے قرآن اور حدیث میں زبان کو قابو میں رکھنے کی بہت تاکید کی گئی ہے اور واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ زبان سے نکلے ہر ہر لفظ کا حساب لیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

”یہ ہماری کتاب ہے جو تمہارے بارے میں سچ سچ بول رہی ہے۔ ہم تمہارے اعمال لکھواتے جاتے تھے۔“

(سورۃ الجاثیہ)

یہ زبان ہی ہے جو دوست کو دشمن بنا دیتی ہے۔ اگر زبان کی حفاظت نہ کی جائے تو اس سے بے شمار اقسام کی برائیاں نکلتی ہیں۔ گناہوں میں سے آدھے سے زیادہ گناہ ایسے ہیں جو صرف زبان کے ذریعے سے ہوتے ہیں مثلاً جھوٹ، چغلی،

اپکا خط ملا



خوب ہنسی آئے۔ آپ کھیل دس منٹ کا، فرق تلاش کریں اور راستہ تلاش کریں کے علاوہ اور بھی سرگرمیاں شائع کریں مثلاً رنگ بھرئیے، نقطے ملائیے اور چیزیں تلاش کریں وغیرہ۔

(زردہ احمد، گوجرہ)

☆ رسالے کے صفحات بڑھانا تو ممکن نہیں البتہ آپ کی دوسری باتوں پر عمل کیا جائے گا۔

اکتوبر کے شمارے میں کہانیاں دوسری بات، جو کل بویا تھا، سام نے سبق سیکھ لیا، انسان اور یہ بھی پاکستان ہے بہت اچھی لگیں۔ (محمد احمد، لاہور)

ہم تعلیم و تربیت بہت شوق سے پڑھتے ہیں، پچھلے ماہ جب میں نے رسالے میں اپنی بنائی ہوئی تصویر دیکھی تو بہت خوشی ہوئی۔ کیا یہ ضروری ہے کہ جو تحریریں ارسال کی جائیں انہیں ایک لائن چھوڑ کر لکھا جائے۔ (آسیہ نواز، بھلوال)

☆ ایسا کرنا ضروری ہے۔

اکتوبر کا شمارہ یکم تاریخ سے پہلے ہی مل گیا۔ تمام کہانیاں بہترین تھیں۔ میں کچھ تحریریں بھیج رہا ہوں قابل اشاعت ہوں تو ضرور شائع کیجئے گا۔ (رانا محمد ہاشم لون، کراچی)

پیارے انکل جی! میں نے فرسٹ ایئر آئی سی ایس کے بورڈ کے پیپر دیئے ہیں اور رزلٹ آنے والا ہے، پلیز انکل آپ میرے لیے ضرور دُعا کریں۔ (ہاجرہ بشری، گجرات)

☆ اللہ تعالیٰ آپ کو کام یاب کرے۔

میرا تعلیم و تربیت کے ساتھ رشتہ 2000ء سے جڑا ہوا ہے، درمیان میں کچھ عرصہ سے یہ رشتہ مجبوریوں کا بنا پر ٹوٹ گیا تھا، پھر الحمد للہ دوبارہ یہ رشتہ جوڑ رہی ہوں، تعلیم و تربیت لاجواب رسالہ ہے، یہ بچوں اور بڑوں میں یکساں مقبول ہے۔

(فاخرہ مشتاق، خوشاب)

☆ ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔

اکتوبر کا شمارہ دل چسپ تھا۔ خصوصاً سرورق پر ماں کی تصویر بہت اچھی لگی۔ کہانی نمبر کا بے صبری سے انتظار رہے۔

(علی احسان، لاہور)

میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ اپنے رسالے کے صفحات میں اضافہ کریں اور سبق آموز کہانیوں کے ساتھ ساتھ جاسوسی کہانیاں اور ایسی کہانیاں بھی شائع کریں جسے پڑھ کر

اکتوبر کے شمارے میں انسان، جو کل بویا تھا، جنت اور عینی اور رابرٹو بہت زبردست کہانیاں تھیں۔ بچوں کا انسائیکلو پیڈیا بہت اچھا سلسلہ ہے۔ اسے جاری رکھیں۔

(محمد طلال قمر سانی، اقراء سانی، جہلم)

اس بار سرورق بہت خوب صورت تھا۔ ہم سب کو اپنے والدین سے محبت اور اُن کی خدمت کرنی چاہیے۔ دوسری بات، سات درختوں والی حویلی، ایک جگہ چھ گلاس اور خوب صورت دھوکا اچھی کہانیاں تھیں۔ (محمد ثوبان میر، گوجرانوالہ)

میں نے پہلی بار مئی 2010 میں تعلیم و تربیت خریدا تھا۔ یہ مجھے بہت پسند آیا اب میں اسے باقاعدہ پڑھ رہا ہوں اور انتظار میں رہتا ہوں کہ کب اگلا شمارہ آئے گا۔ (محمد طیب، خوشاب)

اس بار نظم کا شعبہ اچھا رہا۔ کہانی نمبر کا شدت سے انتظار ہے۔

میں نے اکتوبر کا شمارہ پڑھا ہے، اس میں مندرجہ ذیل تحریریں قابلِ تعریف تھیں۔ جو کل بویا تھا، ایک جگ چھ گلاس، آپ بھی لکھئے میں سے مذاق اور دوسری بات۔ کیا میں ایک ہی لفافے میں سب تحریریں بھیج سکتی ہوں؟ (تحریم فاطمہ، سرگودھا) ☆ جی آپ ایسا کر سکتی ہیں۔

اکتوبر کے شمارے میں تمام تحریریں بہت اچھی تھیں۔ خاص طور پر کہانی ایک جگ چھ گلاس پڑھ کر اور زیادہ محنت کرنے کا شوق پیدا ہو گیا ہے۔ (محمد شکیل، گوجرہ)

مجھے سب سے اچھا سلسلہ ”جنگل سے جنگل تک“ کا لگتا ہے۔ گینئر بک آف ورلڈ ریکارڈ کے بارے میں جان کر بہت خوشی ہوئی۔ اور چچا تیز گام کے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔ کبھی آتے ہیں اور کبھی غائب ہو جاتے ہیں۔ (سیدہ زہرہ جمال، کراچی) ☆ چچا تیز گام اتنے تیز ہیں کہ کبھی بکھار ہی ہاتھ آتے ہیں۔

کہانیوں میں یہ بھی پاکستان ہے، خوب صورت دھوکا اور پھنے خان بے حد پسند آئیں۔ (احسن القویم، سوات)

اکتوبر کا سرورق ماں کی ممتا کے نور سے بھرپور تھا۔ کہانیوں میں ”ایک جگ چھ گلاس“ ٹاپ پر رہی۔ تحریر یہ بھی پاکستان ہے نے دل موہ لیا۔ (سلسلی صفی طرب، ٹمن)

اکتوبر کا تعلیم و تربیت بھی ہر ماہ کی طرح لاجواب تھا۔ کہانیاں پھنے خان، عینی اور رابرٹو، بھیڑیے اور ایک جگ چھ گلاس بے مثال تھیں۔ (علی شہروز، فیصل آباد)

ان بچوں کے بھی خطوط موصول ہوئے

نور فرید، خدیجہ فرید، ولید فرید، سیف اللہ فرید، سیدہ ارم بخاری، معصوب آصف اکبر، امامہ آصف اکبر کراچی۔ سلسلی منظور، خنسا رضوان لاہور۔ سید عون حمین، سرگودھا۔ مردہ شاہد بٹ، سیال کوٹ۔ محمد حسین بلال قادری، راول پنڈی، سارہ کفیل دلا کیٹ۔

چچا تیز گام کی گشدگی پر پریشان ہیں۔ (اسامہ زاہد، فیصل آباد)

میں نے نہم جماعت کے بورڈ کے امتحان میں 480 میں سے 429 نمبر حاصل کیے ہیں۔ انکل دعا کریں میں وہم جماعت میں بھی یونہی اچھے نمبر حاصل کروں۔ (مشعل جلالی، لاہور)

☆ آپ محنت جاری رکھیں، کام یابی آپ کے قدم چومے گی۔

اکتوبر کے شمارے میں مجھے سات درختوں والی حویلی، پھنے خان، حوصلہ نہ ہارو، یہ بھی پاکستان ہے اور بھیڑیے کہانیاں اچھی لگیں۔ (تیور اصغر، ٹوبہ ٹیک سنگھ)

اکتوبر کا شمارہ زبردست تھا خاص طور پر جو کل بویا تھا، خوب صورت دھوکا اور یہ بھی پاکستان ہے کمال کی تحریریں تھیں۔ (عائشہ مجید، لاہور)

اکتوبر کا سرورق بہت پسند آیا۔ کہانیوں میں عینی اور رابرٹو، خوب صورت دھوکا اور ایک جگ چھ گلاس پسند آئیں۔

(سارہ طارق، فیصل آباد)

اکتوبر کا شمارہ بہترین تھا۔ کہانیوں میں دوسری بات، جو کل بویا تھا بہت دل چسپ تھیں۔ (ابرار طارق، جھنگ)

آپ اسلامی ممالک کے بارے میں بھی معلومات فراہم کیا کریں۔ (عائشہ نور، راول پنڈی)

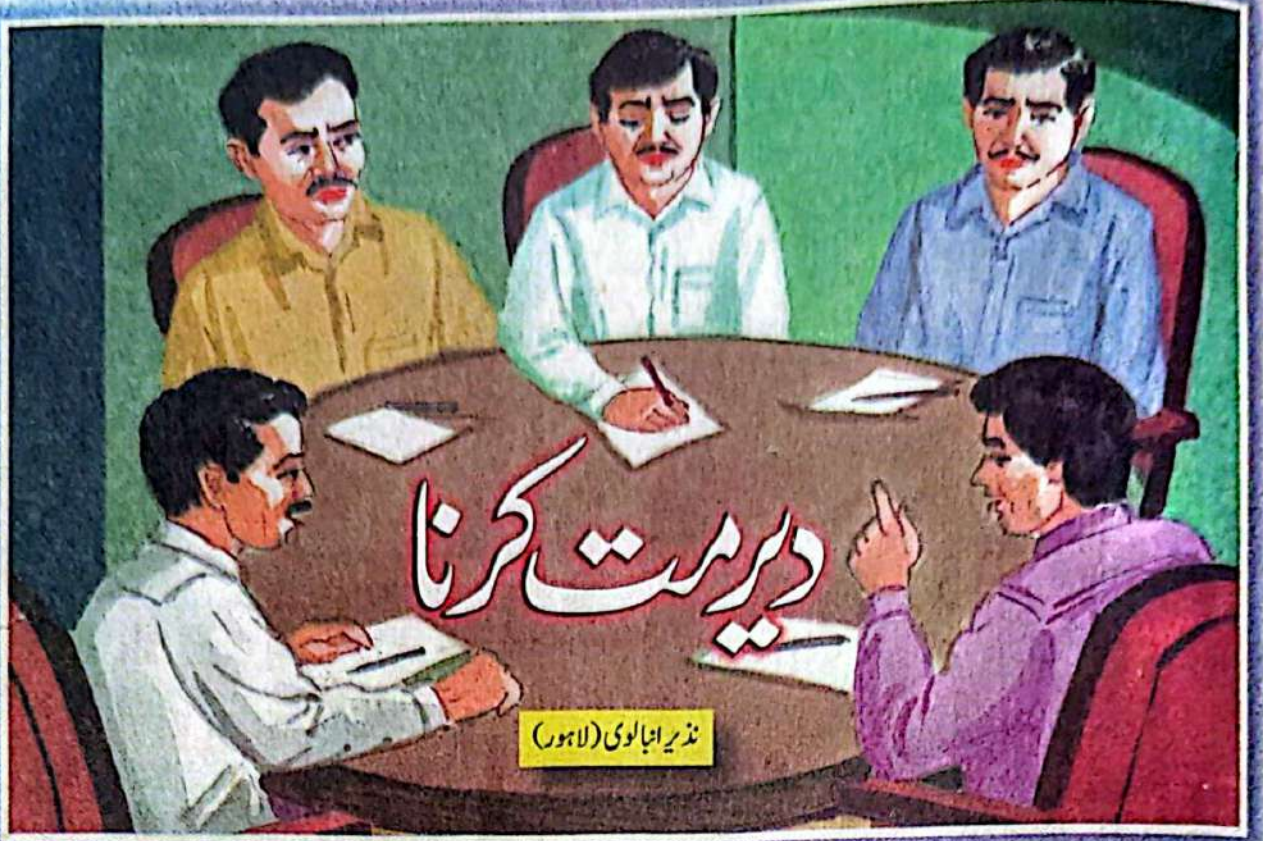
☆ معلومات عامہ میں اسلامی ممالک کے بارے میں معلومات شائع ہوتی رہتی ہیں۔

اس دفعہ کے شمارے میں مجھے پھنے خان کی کہانی سب سے اچھی لگی آئندہ بھی ایسی کہانیاں شائع کیا کریں۔

(حنانت فاطمہ، راول پنڈی)

اکتوبر کے شمارے میں کہانیاں جو کل بویا تھا، خوب صورت دھوکا اور ایک جگ چھ گلاس بہت پسند آئیں۔

(فاطمہ نصیر، راول پنڈی)



میرے حکم پر رجمو نے گودام کا چکر لگایا۔
 ”صاحب جی!“ گودام میں تو کوئی بھی نہیں.....“
 ”پھر وہ کس کی آواز تھی.....؟“
 ”کون سی آواز جی.....؟“ رجمو بولا۔
 ”بس تم جاؤ.....“ رجمو کے جاتے ہی میں کھاتوں میں لگ گیا۔
 ”اب وقت ضائع مت کرو..... پھر کوئی آجائے گا۔“ پھر
 میرے کانوں میں یہ آواز پڑی۔
 ”کون ہے؟ میرے سامنے آؤ۔“ میری پکار کے باوجود
 گودام میں خاموشی تھی۔
 ”اب دیر مت لگاؤ..... نکل پڑو بوریوں سے۔“
 ”نکل پڑو بوریوں سے۔“
 گودام میں اس آواز کے گونجتے ہی بوریوں کے منہ خود
 بخود کھل گئے۔ میں حیرت سے سب کچھ تنکے لگا۔ میں باہر کی
 طرف بھاگنے لگا تو ایک چاولوں کی بوری مجھ پر آگری۔ میں
 نے چیخ ماری تو میری آنکھ کھل گئی۔ میں اپنے بیڈ پر تھا۔
 ”واقعی بڑا عجیب خواب ہے۔“ صدیق بولا۔

پانچ راتیں تھیں اور پانچ خواب تھے۔ انہیں ایک ایک
 رات کے وقفے سے ایک ہی طرح کا خواب دکھائی دے رہا تھا۔
 پانچوں آپس میں گہرے دوست تھے۔ اُن کی شہر کی ایک بڑی
 مارکیٹ میں چاول، آٹا، چینی، گھی اور صابن کی بڑی بڑی
 دکانیں تھیں۔ اُن کا شمار شہر کے مال دار لوگوں میں ہوتا تھا۔
 پانچ دن قبل معراج نے انہیں آکر بتایا تھا کہ اُس نے رات
 ایک عجیب و غریب خواب دیکھا ہے۔
 ”کیسا خواب؟“ اختر نے پوچھا۔
 ”میں اپنے چاولوں کے گودام میں بیٹھا تھا کہ میرے
 کانوں میں سرگوشیوں کی آواز آئی۔“
 ”جلدی کرو اکیلا ہے۔“
 ”ابھی کام ہو جاتا ہے۔“
 میں نے ادھر ادھر دیکھا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔
 ”رجمو.....! اوئے رجمو کے بچے ادھر آ۔“
 میں نے اپنے ملازم کو پکارا۔
 ”گودام کا چکر لگاؤ..... میرا خیال ہے یہاں کوئی ہے.....“
 جلدی کرو.....“

میں آئے میں پوری طرح دب جاتا ایک خوفناک چیخ مجھے
خواب کی عجیب و غریب دنیا سے واپس لے آئی۔“ طفیل بولتا
چلا گیا۔

”ہمیں کسی اللہ والے سے ان خوابوں کی تعبیر کے لئے
رجوع کرنا چاہیے۔“ اختر نے کہا۔
”اختر بھائی درست کہتے ہیں۔“

پھر سب اخبار کی اس خبر کو پڑھنے لگے جس میں نئے بجٹ
میں اشیاء خورد و نوش کے مہنگے ہونے کا امکان ظاہر کیا گیا تھا۔
اس خبر نے ان کے چہروں پر مسکراہٹ پھیلا دی تھی۔ وہ
خواب کو ایک مرتبہ پھر فراموش کر کے کاروبار میں جت گئے۔
شام تک لاکھوں روپوں کا لین دین ہوا۔ پھر سارا دن کسی کی
توجہ خواب کی طرف نہ گئی۔

اب تیسری رات تھی اور تیسرا خواب تھا۔ اختر اپنے
کمرے میں ٹیلی ویژن دیکھتے دیکھتے سو گیا تھا۔ وہ اپنے چینی کے

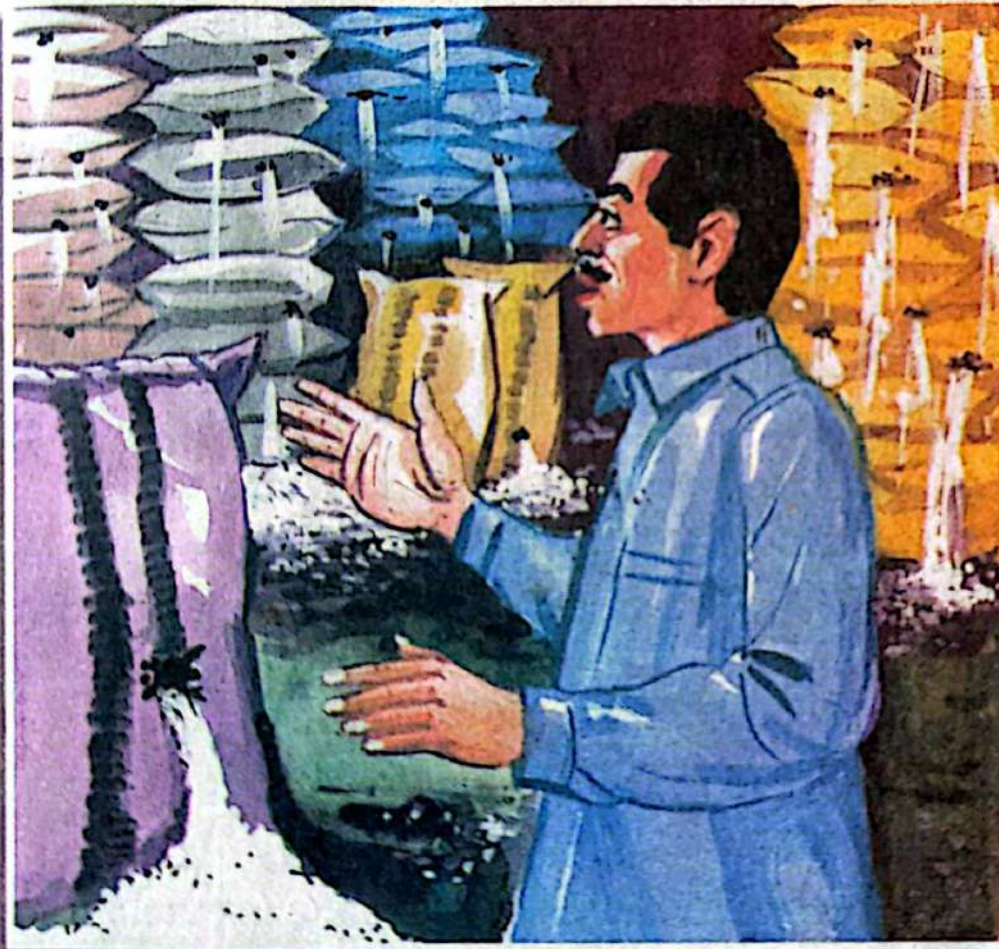
”اللہ خیر کرے گا۔“ اختر نے کہا۔
اس سے پہلے کہ معراج کوئی بات کرتا رہو نے آکر
اطلاع دی۔

”صاحب جی! سورج راکس ملز سے فون آیا ہے۔“
پھر وہ اس عجیب و غریب خواب کو بھول کر اپنے اپنے
کاروبار میں مصروف ہو گئے۔
اگلے روز ان کی ملاقات طفیل سے ہوئی تو وہ کچھ سہا سہا
ساتھا۔

”طفیل! گھر میں تو سب خیریت ہے؟“
”گھر میں تو خیریت ہے؟“
”تو پھر کیا بات ہے؟“ اختر نے فوراً پوچھا۔
”میں نے رات ایک خواب دیکھا ہے۔“
”خواب۔“ معراج نے دہرایا۔
”ہاں معراج بھائی! بالکل تمہارے خواب جیسا۔“

”کیا دیکھا تھا تم
نے؟“ صدیق بولا۔

”میں اپنے آئے
کے گودام میں تھیلوں
کی کتنی کر رہا تھا کہ
اچانک سارے تھیلے ایک
دھماکے سے پھٹ گئے۔
گودام میں چار اطراف
آتا ہی آتا تھا۔ یہ عمل
اتنی تیزی سے ہوا کہ
میں کسی کو مدد کے لئے
پکار بھی نہ سکا۔ آتا
میری آنکھوں، نتھنوں،
منہ اور کانوں میں چلا
گیا۔ آتا بڑھتے بڑھتے
میرے کندھے تک
آگیا۔ اس سے پہلے کہ



عالم دین سے ملتے ہیں۔“

”واقعی ہمیں اب دیر نہیں کرنی چاہیے۔“ معراج کی بات سن کر طفیل نے اس کی تائید کی۔ پھر پانچوں اپنے اپنے کاموں میں اس طرح جت گئے کہ کسی عالم دین سے ملنے والی بات اُن کے ذہن سے نکل گئی۔

پانچویں صبح انہوں نے جب سلیم کی زبانی اُس کا خواب سنا تو وہ اُسی وقت اس خواب کی تعبیر معلوم کرنے کے لئے کسی عالم دین کے پاس چلنے کے لئے تیار ہو گئے۔ سلیم نے بتایا کہ اس نے خواب دیکھا تھا کہ اُس کے گودام میں رکھا صمبن خود بخود جھاگ کی شکل اختیار کر گیا۔ گودام جھاگ سے بھر گیا تھا۔

جج سے اُس کی بھی آنکھ کھل گئی تھی۔ پھر وہ گاڑیوں میں سوار شہر کے ایک بڑے عالم دین سے خواب کی تعبیر معلوم کرنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ ایک گھنٹہ بعد وہ ایک نورانی چہرے والے شخص کے سامنے اپنے خوابوں کے بارے میں بتا رہے تھے۔ سب کے خواب سن کر عالم دین نے کہا:

”اپنے گوداموں میں پڑا ہوا غریبوں کا حصہ انہیں دے دو تم سے عذاب ٹل جائے گا۔۔۔۔۔ اس دن سے ڈرو جب یہ خواب حقیقت بن جائے گا۔ دیر مت کرو۔ مال کو زیادہ نفع کے لالچ میں ذخیرہ مت کرو۔ انہیں فوراً بیچ دو۔ یہی تمہارے لئے بہتر ہے۔“

پانچوں نے خواب کی تعبیر کو عملی جامہ پہنانے کے لئے قریبی بستیوں کے غریبوں کے لئے خورد و نوش کی اشیاء کے پیکٹ بنائے اور خود انہیں تقسیم کرنے کے لئے بستیوں میں چلے گئے، اس عمل سے وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہے تھے۔ وہ جب کھانے پینے کی اشیاء کے پیکٹ لئے ایک دروازے پر پہنچے تو دستک دینے پر ایک لاغر سا ادھیڑ عمر شخص باہر آیا۔

”کیا بات ہے؟“

”تمہیں اور تمہارے بچوں کو کھانے پینے کی چیزیں دینے

گودام میں موجود تھا۔ ہزاروں بوریاں دیکھ کر وہ خوش ہو رہا تھا کہ آئندہ بجٹ میں اسی چینی سے اسے لاکھوں کا نفع ہو گا۔ وہ چہرے پر مسکراہٹ سجائے بوریوں کو دیکھ ہی رہا تھا کہ اُس کے کانوں میں خوفناک دھماکے کی آواز پڑی۔ ساری چینی کی بوریاں پھٹ چکی تھیں۔ وہ یہ منظر دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا۔ اب وہ تھا اور چینی تھی۔ اُس کے منہ میں چینی داخل ہوئی تو وہ میٹھی ہونے کے بجائے کڑوی تھی۔ اُس نے کڑوی چینی تھوکنے کے لئے منہ کھولا تو مزید چینی اُس کے منہ میں چلی گئی وہ کوشش کے باوجود کچھ نہ بول پایا۔ چینی اس کے اطراف میں پھیلتی جا رہی تھی۔ وہ چیخا چلاتا اٹھ بیٹھا تھا۔ کمرے کا منظر پہلے جیسا ہی تھا۔ ٹیلی ویژن سکرین پر فرمان الہی کا پروگرام چل رہا تھا۔ اُس نے اپنے خشک حلق کو پانی سے تر کیا۔

”اودھ میرے خدا۔۔۔۔۔ کتنا خوف ناک خواب تھا۔“ اختر بولا۔ چوتھی صبح صدیق نے انہیں اپنا خواب بتاتے ہوئے کہا کہ اس کے گودام میں رکھے گھی کے کنستروں سے گھی پانی کی طرح بہنے لگا پہلے پہل تو میں اُسے وہم جانتا رہا مگر جب گھی گودام میں پھیلتا چلا گیا تو مجھے خوف محسوس ہوا۔ میں باہر کی جانب بھاگا تو چکنائی کی وجہ سے پھسل کر گر پڑا۔ پھر جیسے ہی میں اٹھنے کی کوشش کرتا دوبارہ گر پڑتا۔ اس عرصہ میں گھی مجھے اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔ میرے سارے جسم پر گھی ہی گھی تھی۔ میں نے اپنے ملازموں کو مدد کے لئے پکارا، مگر اُن میں سے تو کوئی نہ آیا البتہ میری جج دیکار سے میری ننھی بیٹی ندا اٹھ بیٹھی۔ اُس نے میرے ماتھے پر آئے پسینے کو پونچھتے ہوئے پوچھا:

”پاپا! کیا کوئی خواب دیکھا ہے؟“

”ہاں میں نے ایک خوف ناک خواب دیکھا ہے۔“

میں نے اپنی بیٹی کو خواب کی تفصیل تو نہیں بتائی مگر اُس نے میرے خوف زدہ چہرے کو دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ واقعی خواب بہت ڈراؤنا تھا۔

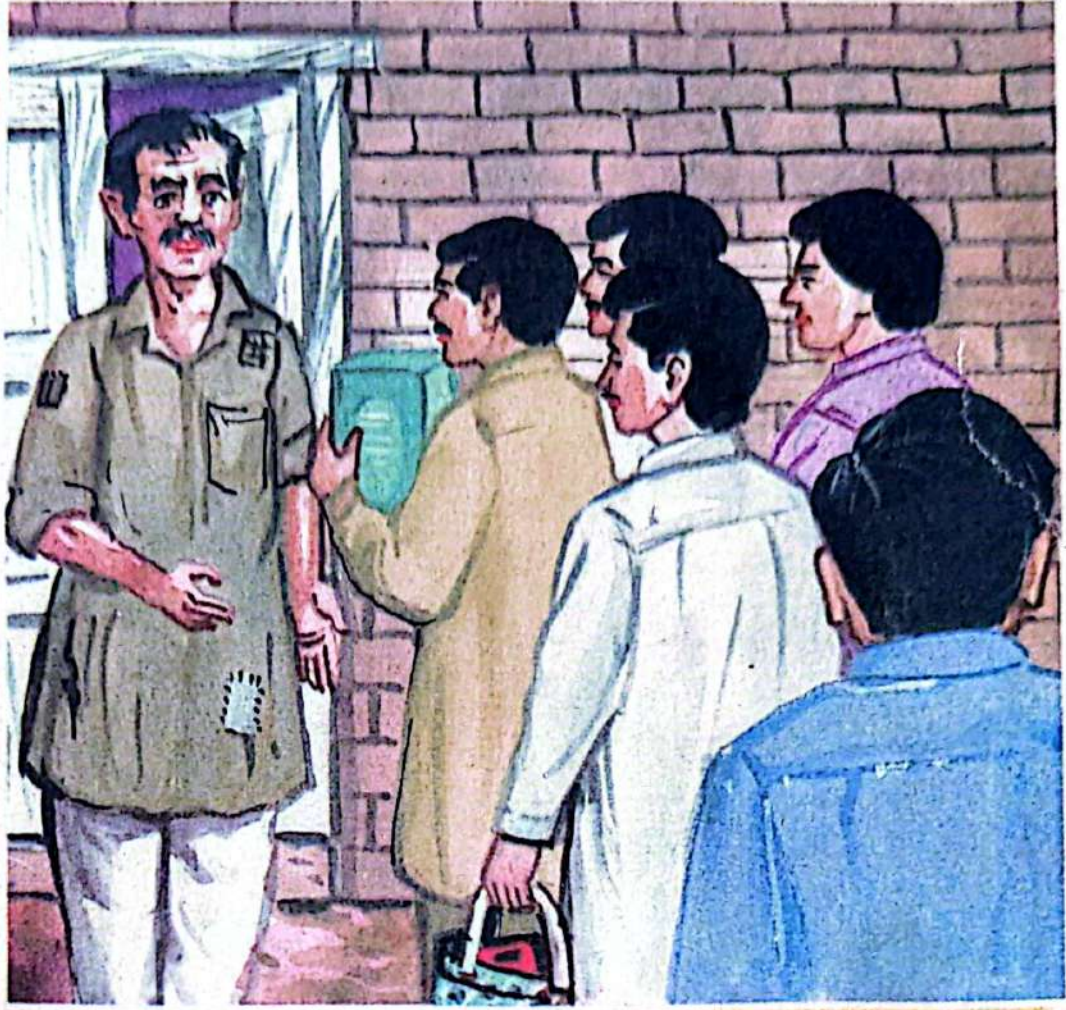
”ہمیں اب دیر نہیں کرنی چاہیے۔ ہم آج شام ہی کسی

کمرے سے ایک پرانا
ساختر اور ایک رسی
پکڑے اُن کے
سامنے آیا۔

”یہ سب کیا ہے؟“
طفیل نے پوچھا۔

”آپ بروقت آئے
ہیں۔ آپ دس
پندرہ منٹ اور نہ
آتے تو۔“ یہ کہتے
کہتے اُس کی آواز
رندہ گئی۔ اختر نے
پیارے اُس کے
کندھے پر ہاتھ
رکھا۔

”آپ تھوڑی دیر
اور نہ آتے تو کل
اخبار میں یہ خبر

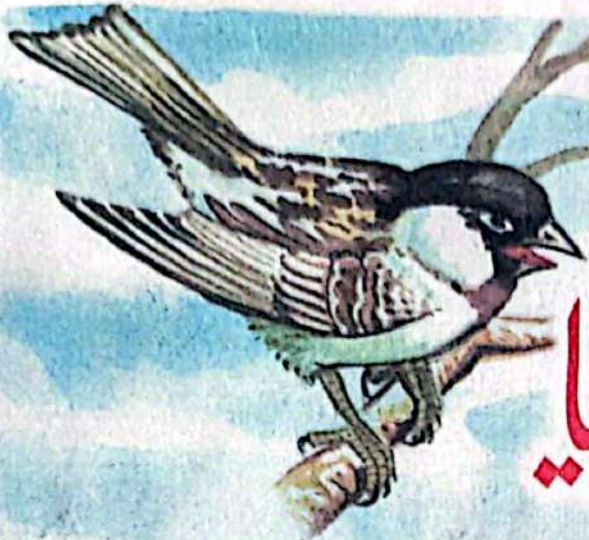


پڑھتے کہ غربت سے تنگ آکر ایک شخص نے اپنے بیوی بچوں
سمیت زندگی ختم کر لی..... آپ ہمارے لئے زندگی بن کر
آئے ہیں..... آپ نے دیر نہیں کی۔“
یہ سن کر پانچوں کو یوں لگا کہ جیسے وہ بروقت آئے ہوں
حال آں کہ وہ لیٹ تھے۔

”ہم پہلے ہی لیٹ ہیں..... آؤ جلدی کرو..... اور بہت سے
لوگ ہمارے منتظر ہیں..... دیر مت کرو۔“ طفیل بولا۔
”ہاں، ہاں آؤ، جلدی کرو۔“ صدیق نے کہا۔
پھر سب اپنے اپنے حصے کا پیکٹ لاغر شخص کو تھا کر
اُس کے چہرے سے پھوٹنے والی روشنی کو تکتے ہوئے اُن
منتظر چہروں کی طرف بڑھ گئے جو اُن کی راہ تک رہے
تھے۔

☆☆☆

آئے ہیں۔“ اختر نے کہا۔
”کھانے پینے کی چیزیں۔“ لاغر شخص نے اتنا کہہ کر
زار و قطار رونا شروع کر دیا۔
”بھئی رو کیوں رہے ہو؟“ سلیم نے پوچھا۔
”آپ میرے اور میرے بیوی بچوں کے لئے فرشتہ بن
کر آئے ہیں۔“ اُس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔
”وہ کیسے؟“ صدیق بولا۔
”آپ اندر آجائیے۔“
”مگر کیوں؟“ معراج نے حیرت کا اظہار کیا۔
”بس آپ اندر آجائیے۔“
”لاغر شخص کے اصرار پر وہ اس کے گھر میں چلے گئے۔ گھر
کی ہر چیز مفلسی کا پتہ دے رہی تھی۔ پانچوں حیران تھے کہ آخر
یہ شخص انہیں اندر کیوں لایا ہے۔ چند لمحوں بعد لاغر شخص



پیری چڑیا

بول ری پیری چڑیا بول
 میرے کانوں میں رس گھول
 زمیں پر چونچ تو ملتی ہے
 ننگے پاؤں کیوں چلتی ہے
 جوتے لے دوں تجھ کو مول
 بول ری پیری چڑیا بول
 تیرے پر ہیں پیارے خوب
 رنگ ہیں ان کے نیارے خوب
 پروں کو اپنے پھر سے کھول
 بول ری پیری چڑیا بول
 صبح سویرے اٹھے تو
 حمد کرے تو اللہ ہو
 آ پھر کانوں میں رس گھول
 بول ری پیری چڑیا بول
 چاند ، ستارے ، مچھلی ، دریا
 پہاڑ ، شجر ، اور بہنا بھیا
 خالق کی ہر شے انمول
 بول ری پیری چڑیا بول
 منے تو بھی سستی چھوڑ
 اٹھ مسجد کی جانب دوڑ
 آگنی چڑیا ، آنکھیں کھول
 بول ری پیری چڑیا بول

فرزانہ چیمہ، لاہور

میری زندگی کے مقاصد



امیر اشرف، 14 سال
میری زندگی کا مقصد ڈاکٹر بن کر
مریضوں کا علاج کرنا ہے۔



امیر اشرف، 14 سال
ایک اچھا انسان بننا میری زندگی کا
سب سے اہم مقصد ہے۔



محمد عرفان، 14 سال
میں کرکٹر بن کر پاکستان کرکٹ ٹیم
کو ورلڈ کپ کا فاتح بنانا چاہتا ہوں۔



احمد ظفر، 14 سال
میں کرکٹر بن کر ملک کا نام روشن
کرنا چاہتا ہوں۔



محمد احمد صدیقی، 14 سال
میں بڑا ہو کر کمائڈر بنوں گا اور
والدین کی خدمت کروں گا۔



محمد اسامہ، 14 سال
میں بڑا ہو کر پاکستان بن کر ملک و قوم
کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔



محمد عبداللہ، 14 سال
میں ڈاکٹر بن کر ملک و قوم کی
خدمت کرنا چاہتا ہوں۔



محمد طلحہ قرسائی، 14 سال
سی۔ ایس۔ پی آفیسر بن کر ملک و قوم
کی خدمت کروں گا۔



زین علی، 14 سال
ان شاء اللہ میں ڈاکٹر بن کر انسانیت
کی خدمت کروں گا۔



عائشہ مجید، 14 سال
میں بڑی ہو کر نیچر بنوں گی اور علم
کی روشنی دوسروں کی تک پہنچاؤں
گی۔



امیر مقبہ، 14 سال
میں فوجی بن کر پاکستان کی
سرحدوں کی حفاظت کروں گا۔



فاطمہ، 14 سال
میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بنوں گی اور
لوگوں کا صحت علاج کروں گی۔



حافظ الطاف الرحمن، 14 سال
میں انصاف پسند منصف بن کر
غریبوں کو انصاف فراہم کروں گا۔



مہر محمد، 14 سال
میری زندگی کا مقصد یہ ہے کہ
میں پاکستان بن کر ملک و قوم کی
خدمت کروں۔



محمد ظفر، 14 سال
میں بڑا ہو کر پاکستان بنوں گا اور ملک
کا نام روشن کروں گا۔



آمنہ، 14 سال
میں بڑی ہو کر نیچر بنوں گی اور
ملک و قوم کی خدمت کروں گی۔



شیریں جمیل، 14 سال
نیچر بن کر تعلیم عام کرنا میری
زندگی کا مقصد ہے۔



رانا محمد ہاشم، 14 سال
میں ہاڈی جڈر بن کر ملک کا نام
روشن کروں گا۔ یہ میری
زندگی کا مقصد ہے۔



عبدالصمد بیٹ، 14 سال
میں بڑا ہو کر ایک نیک انسان بننا
چاہتا ہوں اور تعلیم کھل کر کے
فی وی کمپیئر بننا چاہتا ہوں۔



احمد حسن، 14 سال
میں فٹ بال کا ماحلی کھلاڑی بننا چاہتا
ہوں۔ میں اس کے لیے سخت
مہنت کر رہا ہوں۔



محمد، 14 سال
میں بڑی ہو کر نیچر بنوں گی اور
انسانیت کی خدمت کروں گی۔

میری زندگی کے مقاصد

کے لیے یہ کوپن پر گراؤر پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔
نام.....
مقاصد.....

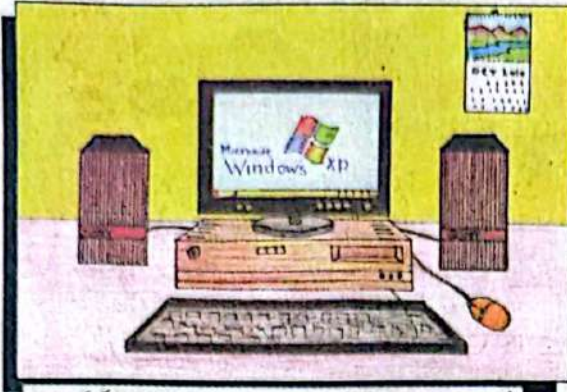


تمام صرف اعلیٰ درجہ میں ہیں



کمپیوٹر

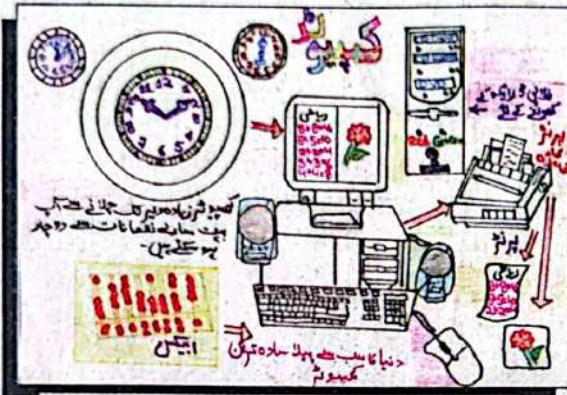
چھوٹا ہونہار مصور



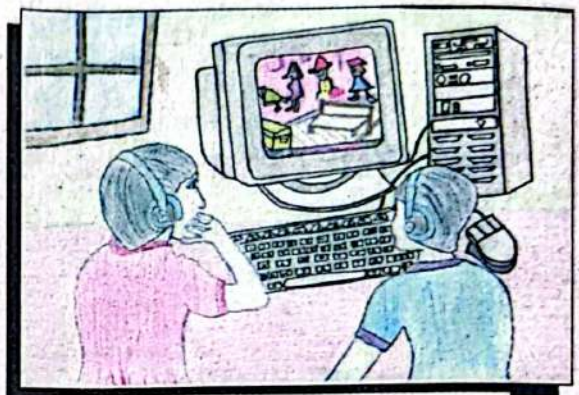
شہزین سید، صادق آباد (دوسرا انعام: 150 روپے کی کتب)



عائشہ منور، اسلام آباد (پہلا انعام: 175 روپے کی کتب)



نمرہ عابد، لاہور (چوتھا انعام: 100 روپے کی کتب)



باریہ یاسین، فیصل آباد (تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)



مریم طارق، لاہور (چھٹا انعام: 75 روپے کی کتب)



محمد انیس، سرگودھا (پانچواں انعام: 90 روپے کی کتب)

کچھ اچھے مصوروں کے نام یہ ذریعہ قریب اندازاً: اربہ سیف چیچہ وطنی۔ رحمان سیدیہ سر فراز قلعہ دیدار سنگھ۔ بچلہ کرن ٹیکسلا۔ آسیہ نواز بھٹوال۔ سلمیٰ مفتی چکوال۔ عائشہ شیخ راول پنڈی۔ عقی بنت اشرف ملتان۔ سارہ طارق فیصل آباد۔ احسن اعجاز ڈیرہ غازی خان۔ محمد حسین بلال قادری راول پنڈی۔ فخر زمان سیال وہاڑی۔ فاطمہ بنت مصطفیٰ صادق آباد۔ سید محمد علی تقی لاہور۔ احمد حیدر خان، علی حیدر خان کوٹ ادو۔ تحریم فاطمہ سرگودھا۔ تسبیہ فاطمہ جھنگ۔ اذہا انکھار لاہور۔ خدیجہ شیخ رضا شیخ راول پنڈی۔ دانیال احمد کراچی۔ اختر جمیل ماسکو۔ عائشہ انکھار اسلام آباد۔ روبینہ مقبول لاہور۔ عالیہ گیلانی نوشہرہ۔ علی امان پشاور۔ عدنان احمد کراچی۔ احسن علی ملتان۔ مزہ علی رحم یار خان۔ عامر احمد انک۔ عبدالرحمان قریشی ایبٹ آباد۔ زینب نور مظفر آباد۔ فاطمہ تحریم سیال کوٹ۔ محمد اویس گوجرانوالہ۔ محمد راشد انک۔ ارسلان بٹ کوئٹہ۔ موسیٰ عمران لاہور۔ ☆

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتہ لکھے اور سکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹر سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

آخری تاریخ 8 نومبر

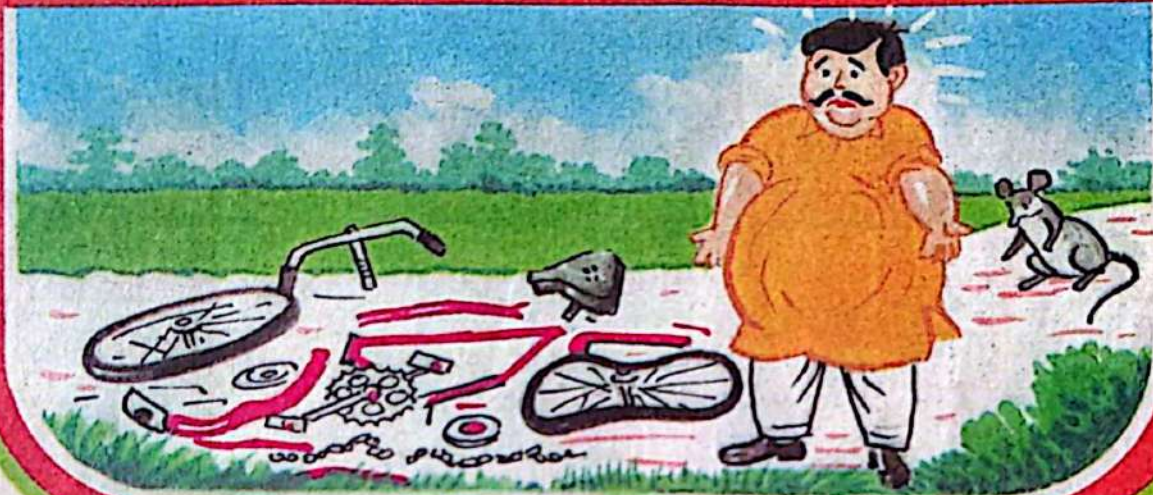
آخری تاریخ 8 دسمبر

جنوری کا موضوع: سوانحی فون

دیکر کا موضوع: حرم کا مضمون

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجئے اور 500 روپے کی کتب لیجئے۔
عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10 نومبر 2010ء ہے۔

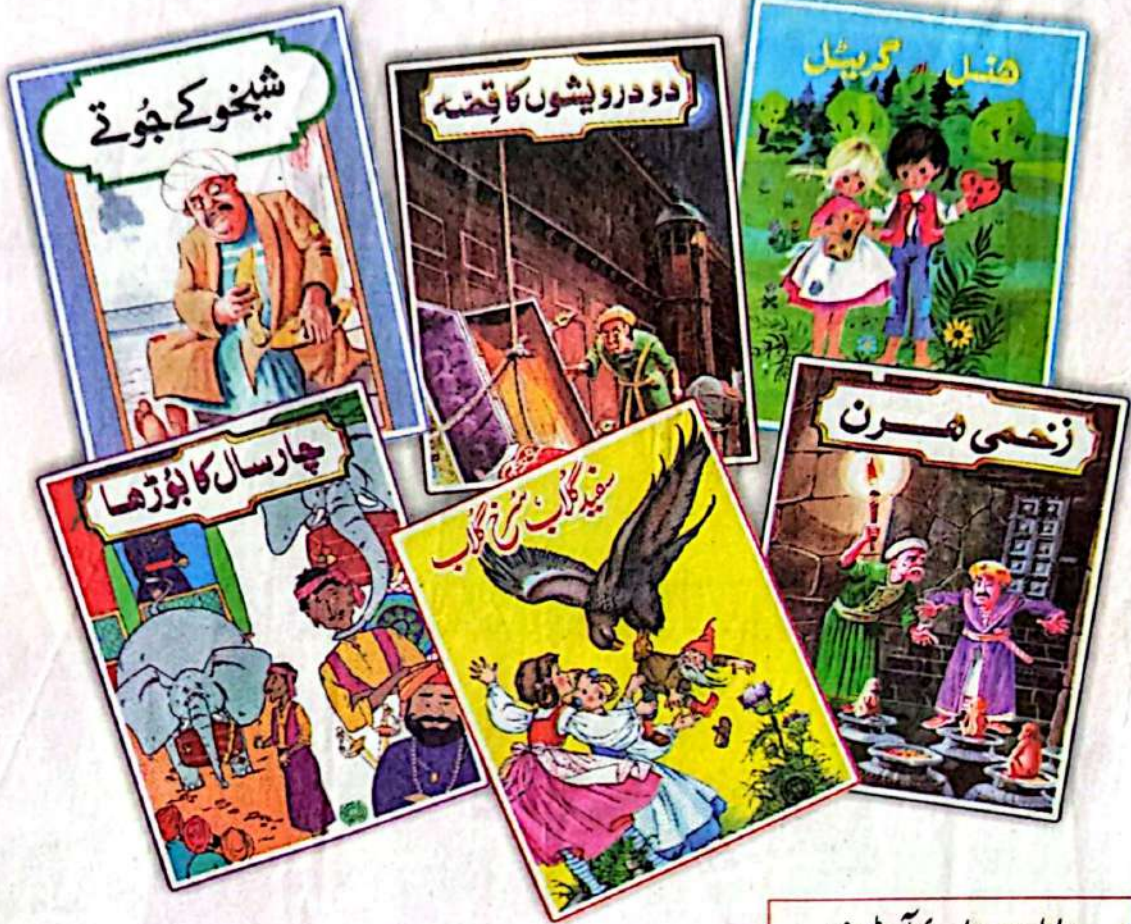
بلا عنوان



- اکتوبر 2010ء کے ”بلا عنوان کارٹون“ کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے،
اُن میں سے مجلس ادارت کو 200 عنوانات پسند آئے اور یہ ساتھی
بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے کی کتب کے انعامات کے حق دار قرار پائے۔
- ☆ اویس شوکت، فیصل آباد (غبارے کی مار، بڑے میاں ہوئے فرار)
 - ☆ علی احسان، لاہور (لوٹ کے نکھر منہ کو آئے)
 - ☆ محمد طیب، خوشاب (اے موٹے غلیل والے، اب ذرا ٹخبر دوڑنے والے!)
 - ☆ سردار سید شہاب علی نقوی، ٹیکسلا (ایک ہاتھ دو، ایک ہاتھ لو)
 - ☆ ایسہ بانو، گجرات (میں ہوں مسٹر غبارہ، مجھے مارنا نہ دوبارہ)

دل چسپ اور سبق آموز کہانیاں

... پیارے بچوں کے لیے پیاری پیاری کہانیاں ...



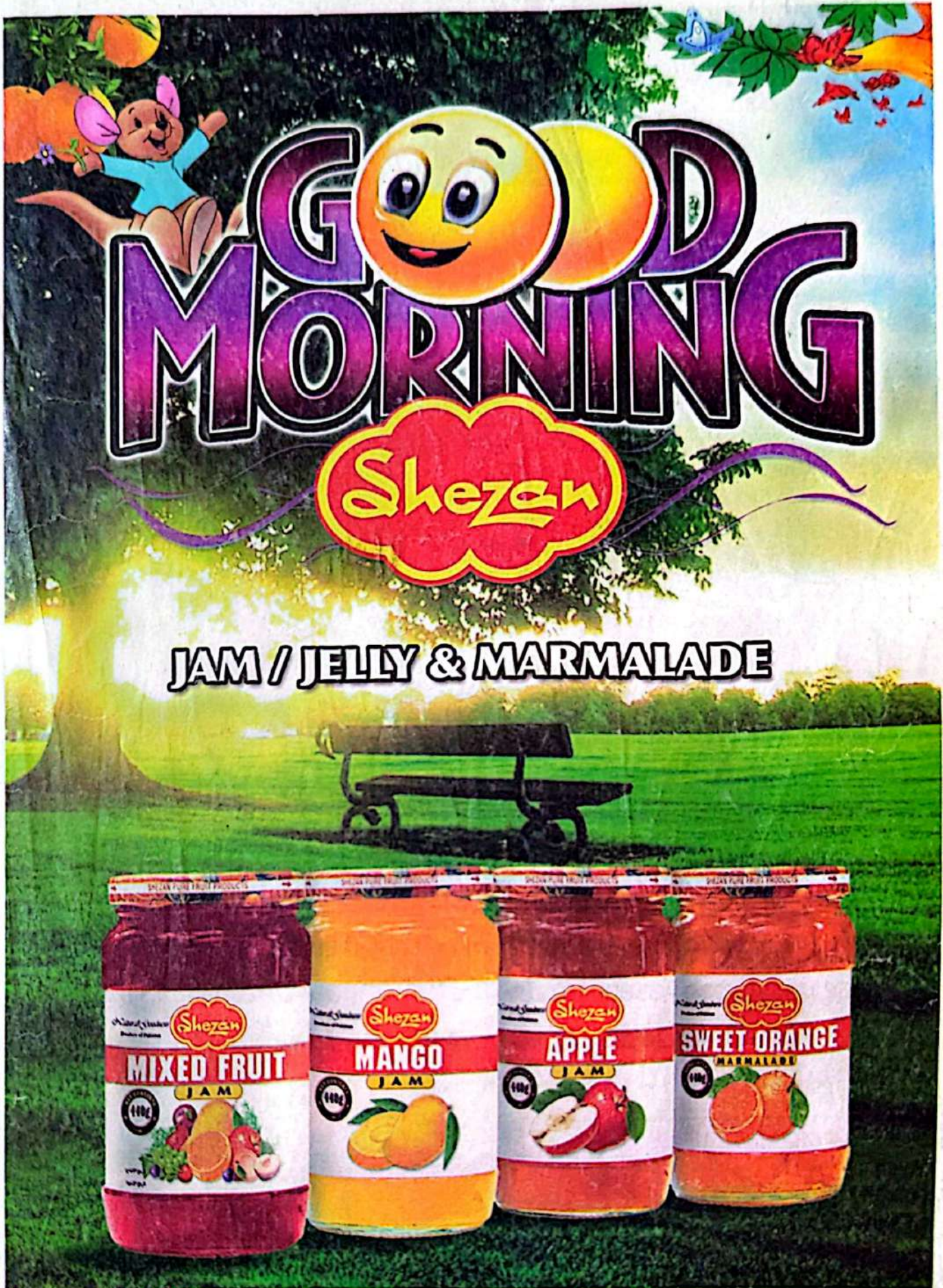
ہدایات برائے آرڈرز:

- پنجاب: 60 شاہراہ قائد اعظم، لاہور 042-111-626262
- سندھ اور بلوچستان: پہلی منزل، مہراں ہائٹس، مین کلفٹن روڈ، کراچی 021-35867239 - 35830467
- خیبر پختونخوا، اسلام آباد، آزاد کشمیر اور قبائلی علاقے: 277 پشاور روڈ، راول پنڈی 051-5124970 - 5124897



ہمارے شعریہ میں آپ کے لیے انتہائی دیدہ زیب اور معیاری
کتابیں دستیاب ہیں

فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ
لاہور - راولپنڈی - کراچی



JAM / JELLY & MARMALADE



250 x 1 x 007
300 x 2 x 609
1250 x 3 x 057